تحقیقِ غالب
ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن
اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

تحقیقِ غالب

ڈاکٹر سیّد معین الرّحمٰن

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور

طبع اوّل : ۱۹۸۱ء
ناشر : اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی
مطبوعہ: بابُ الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی

مُندرجات

"ایک مضمون کو کامیاب سمجھنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا
چاہیے کہ وہ کہاں تک نئی اطلاع کا حامل ہے۔ دوسرے
یہ کہ دادِ تحقیق کہاں تک دی گئی ہے۔ اس سے یہ مطلب
ہے کہ اگر اور کوئی شخص اسی مضمون پر قلم اُٹھائے تو
اس پر کوئی جدید اضافہ نہ کر سکے ـــــــ"

ـــــ حافظ محمود شیرانی

اُردو تحقیق کے دبستانِ لاہور کے نام

ماضی:

حافظ محمود شیرانی

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع

پروفیسر سیّد وقار عظیم

حال:

ڈاکٹر وحید قریشی

مستقبل:

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی

محمد اکرام چغتائی

"اُردو میں ادبی تحقیق کا باضابطہ آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں شیرانی صاحب سے ہوتا ہے جنہیں بآسانی اور بلا تکلف اُردو میں تدوین و تحقیق کا معلّم اوّل کہا جا سکتا ہے۔ ان کے تحقیقی کارنامے آج بھی مثال اور معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ـــــ رشید حسن خاں

"لاہور ہی کے مولوی محمد شفیع کی شخصیت بھی قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے۔ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع وغیرہ کو اُردو میں تحقیقی کام کے میدان میں ایک طرح سے اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ ان اصحاب کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں میں بھی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔" ـــــ مالک رام

"دبستانِ لاہور کے محققین بنیادی طور پر مورّخ ہیں۔ ان جامع کمالات شخصیتوں کے علم اور مطالعے کی حدود کا احصا ممکن نہیں۔ راقم الحروف کو شیرانی صاحب سے براہِ راست استفادے کا موقع نہیں ملا لیکن اُن کی تحریروں کی مدد سے اُن کے علمی مرتبے کو دیکھا، اور اُن کے طریقِ کار کو خاص طور پر پسند کیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب سے استفادے کا زمانہ اُن کی زندگی کے آخری چھ برس پر مشتمل ہے۔" ـــــ ڈاکٹر وحید قریشی

"پروفیسر سیّد وقار عظیم ذمّہ دار نقّاد اور محقّق اور تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے ایک مینارۂ نور اور خضرِ خجستہ گام کی حیثیت رکھتے تھے پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ان کی نگرانی اور رہنمائی میں ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد پاکستان کی کسی یونیورسٹی کے کسی بھی اُستاد سے زیادہ ہے۔" ـــــ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

"محقّق ہونے کا مَیں دعویٰ نہیں کرتا لیکن تنقید میں اگر میری بات سُنی جاتی ہے اور پسند کی جاتی ہے تو ہر تنقید کے پیچھے تھوڑی بہت تحقیق ضروری ہے، کوئی نقّاد صحیح تنقید اس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کا مزاج تحقیقی بھی نہ ہو۔" ـــــ سیّد وقار عظیم

ڈاکٹر سیّد مُعین الرّحمٰن :

ولادت :

بھٹنڈہ (پٹیالہ) ، مشرقی پنجاب ، انڈیا : ۵ ، نومبر ۱۹۴۲ء

درسگاہیں :

میٹرک (۱۹۵۷ء) ، انٹر (۱۹۵۹ء) : گورنمنٹ کالج ، بہاول نگر

بی ۔ اے (۱۹۶۱ء) ، فرسٹ ایل ایل بی (۱۹۶۳ء) : اُردو کالج ، کراچی

ایم ۔ اے ، اُردو (۱۹۶۴ء) : کراچی یونیورسٹی ، کراچی

پی ایچ ۔ ڈی ، اُردو (۱۹۷۲ء) : سندھ یونیورسٹی ، حیدرآباد

مشاغل :

ریسرچ اسکالر ، ترقیٔ اُردو بورڈ ، کراچی : ۱۹۶۳ء — ۱۹۶۴ء

لیکچرار ، شعبۂ اُردو ، گورنمنٹ کالج ، بہاول نگر : ۱۹۶۴ء — ۱۹۶۵ء

لیکچرار ، شعبۂ اُردو ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور : ۱۹۶۵ء — ۱۹۶۶ء

لیکچرار ، شعبۂ اُردو ، ایف سی کالج ، لاہور : ۱۹۶۶ء — ۱۶ ، جنوری ۱۹۷۴ء

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو ، گورنمنٹ کالج (لائل پور) فیصل آباد :
۱۷ ، جنوری ۱۹۷۴ء — ۲۵ ، فروری ۱۹۸۱ء

مطبوعات و مُرتّبات :

۱ ۔ بابائے اُردو — احوال و افکار : طبع اوّل ، کراچی ، ۱۹۶۴ء
باضافہ و ترمیم ، لاہور ۱۹۷۶ء ، طبع سوم : دہلی
سری نگر ، گورکھپور ، لکھنؤ ، بمبئی ، ۱۹۷۹ء

۲ ۔ سیّد وقار عظیم — سوانحی خاکہ : لاہور ، ۱۹۶۷ء ، اشاعت اوّل کراچی ۱۹۸۰ء

۳ ۔ نقدِ عبدالحق : لاہور ، ۱۹۶۸ء

۴۔ خیالستان (جلد دوم): طبع اوّل لاہور/کراچی، ۱۹۶۸ء، باضافہ و ترمیم

لاہور ۱۹۷۶ء باضافہ و ترمیم، لاہور ۱۹۸۱ء

۵۔ اشاریۂ غالبؔ[1] : لاہور، ۱۹۶۹ء

۶۔ آپ بیتی۔ رشید احمد صدیقی : طبع اوّل لاہور، ۱۹۷۰ء، طبع دوم،

لاہور، ۱۹۷۳ء طبع سوم، دہلی بمبئی، ۱۹۷۷ء باضافہ و ترمیم لاہور ۱۹

۷۔ مُطالعۂ یلدرم[2] : لاہور، ۱۹۷۱ء

۸۔ غالبؔ اور انقلابِ ستاون[3] : طبع اوّل، لاہور ۱۹۷۳ء، باضافہ و ترمیم

لاہور، ۱۹۷۶ء طبع سوم، لاہور، ۱۹۸۱ء

۹۔ ذکرِ عبدالحق : لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۰۔ قائداعظم اور لائل پور : لاہور، ۱۹۷۶ء

۱۱۔ دیوانِ غالبؔ (ترتیب) : طبع اوّل لاہور، ۱۹۷۶ء، باضافہ مقدمہ زیرِ طبع

۱۲۔ جامعات میں اقبالؔ کا تحقیقی اور تنقیدی مُطالعہ : لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۳۔ اقبالیات کا مُطالعہ (سیّد وقار عظیم) : لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۴۔ فرمودات عبدالحق[4] : لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۵۔ تحقیقِ غالبؔ : کراچی، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۶۔ غالبؔ کا مُستقل تصنیفی سرمایہ : زیرِ طبع، کراچی

۱۷۔ غالب کا مُتفرق تصنیفی سرمایہ : زیرِ طبع، کراچی

موجودہ مصروفیت :

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

پتا : پوسٹ بکس نمبر ۲۴۴، لاہور۔

---

[1] "اشاریۂ غالبؔ" پر ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام، تین ہزار روپے عطا کیا۔

[2] "مطالعۂ یلدرم" پر ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام، پانچ ہزار روپے عطا کیا۔

[3] "غالبؔ اور انقلابِ ستاون" پر ۱۹۷۳ء کا داؤد ادبی انعام، پانچ ہزار روپے عطا کیا۔

[4] "فرمودات عبدالحق" پر ثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق کا انعام برائے ۱۹۸۰ء عطا کیا۔

حرفِ چند :

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

"تحقیقِ غالب" میں دس مقالات شامل ہیں جو غالب صدی (فروری ۱۹۶۹ء) کے بعد کی ایک دہائی کا اکتساب ہیں۔ غالب اور آثارِ غالب کے سلسلے کے ان معروضی مُطالعات کی نوعیت بیشتر تحقیقی ہے اور انہیں کسی ادّعا کے بغیر، لیکن اس انکسار اور احساس کے ساتھ کتابی صورت میں یک جا کیا جا رہا ہے کہ ان کا مطالعہ غالب فہمی کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ مُعین اور مُفید ہو گا ——

قاضی عبدالودود نے بین الاقوامی غالب سمینار (دہلی ۱۹۶۹ء) کے افتتاحی خطبے (۱۷۔فروری ۱۹۶۹ء) میں منجملہ اُمور دیگر کہا تھا کہ :

"......I happen to be one of those who try to see things as they are, and not as I would like them to be. I agree with Johnson that exaggerated praise defeats its own purpose, and I hold with Voltaire that the only debt the living owe to the dead, is that they should tell the truth about them."

نظری اعتبار سے یہ مجھے اپنے ہی جی کی آواز معلوم ہوتی ہے، گو عملاً میں اس معیار کو ہر جگہ قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا ہوں ——

○

رشید احمد صدیقی کے الفاظ اور اسلوب میں کہہ سکتا ہوں کہ کارِ تحقیق نے کسی اور کام کا نہ رکھا! یہ سخت گیر اور شکی محبوب کی طرح نہیں چاہتا کہ اس کے ادبیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے، یا اس کے سوا کسی اور طرف ملتفت ہُوا جائے! —— تحقیقی کام میں گم اور مگن اصحاب کو جہاں تہاں گفتار کے غازیوں کی جانب سے "قلیل المعاشرت" ہونے کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ اس طرح کے مجلسی جھگڑوں کو رشید حسن خاں کی یہ بات کون بتائے کہ: تحقیق، شرک گوارا نہیں کرتی۔ اس کے لیے جس انہماک، یک سوئی اور ڈوب جانے والی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے، ہنگامہ آلود زندگی اس کے منافی ہے ——"

مجھے شبہ ہے کہ ماضی میں حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع یا مولانا امتیاز علی عرشی —— اور حال میں قاضی عبدالودود کسی چائے خانۂ خام یا "کافی ہاؤس" کی مستقل زینت پائے گئے ہوں —— یا آج کے بہت سے "سال خوردہ جوانوں" کی طرح انھوں نے "لابی" بنانے یا نیم ادبی کالموں میں جگہ پانے کا اہتمام کیا ہو۔ ادب میں "باقی" رہنے کی فکر سے زیادہ "تازہ" رہنے کے شوقِ بے مُہار کو میں ادب یا ادیب کے لیے نیک فال نہیں جانتا —— شعبہ یا میدان کچھ بھی ہو، کوئی گہرا، دائمی نقش چھوڑا ہی نہیں جا سکتا، جب تک اس مخصوص شعبے یا فن کے ادبیٰ مطالبات تک سے استوار اور پائیدار پیمان نہ باندھ لیا جائے اور ریاضت کو شیوہ اور شعار نہ بنا لیا جائے —— اس کے لیے ہمیں حلقوں اور کالموں کے پھیر اور غول سے نکلنا اور بلند ہونا ہوگا!

○

یہ دس مقالات، پچھلی دہائی (۱۹۶۹ء —— ۱۹۷۹ء) میں لکھے گئے اور شائع ہوئے —— اور مابعد کبھی پوچھ کر اور بیشتر بلا اطلاع مختلف رسائل کے خاص نمبروں

میں نقل ہوئے یا انتخابات وغیرہ میں شامل کیے گئے ـــــ لیکن بصورتِ موجودہ یہ لازماً بالکل اُسی طرح نہیں ہیں، جس طرح یہ پہلی بار چھپے تھے، نئے مآخذ کی روشنی میں جہاں تہاں بعض اجزاء، ایزاد یا قلمزد بھی ہوئے ہیں۔ اوّلین صورت میں یہ مقالات مُلک اور بیرونِ مُلک کے ان اَدبی اور تحقیقی رسائل میں شائع ہوئے:

لاہور: نقوش، راوی، اورینٹل کالج میگزین، مجلۂ تحقیق

کراچی: اُردو، اُردو نامہ، العلم

دہلی: غالب نامہ

پٹنہ: زبان و ادب

ـــــ اُردو اکیڈمی سندھ کے جناب علاء الدین خالد کا دلی شکریہ واجب ہے، جو اب، ان تحریروں کو اپنی روایتی خوش ذوقی سے صورتِ کتاب دے رہے ہیں۔

اس مجموعۂ مقالات اور مُطالعات کی کمزوریوں سے میں بے خبر نہیں، لیکن ان کے جواز میں عذر خواہی کے طور پر بھی اس پامال بات کو دہرانے کا روادار نہیں ہوسکتا کہ خامیاں کس انسانی کاوش میں نہیں ہوتیں! بایں ہمہ یہاں بدرجۂ آخر پروفیسر ای۔جی۔براؤن کی ایک بات ضرور یاد آتی ہے کہ: "جسے بے عیب دوست کی تلاش ہوتی ہے، یقیناً اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا! ـــــ"

شعبۂ اُردو
گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۲۳۔مارچ ۱۹۸۱ء

"—— ہمہ گیری کا خیال ترک کیجیے۔ زیادہ نہ لکھیں تو مضائقہ نہیں، جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ اس پر اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ اتفاقی غلطی اور بات ہے —— دوسروں کے متعلق خواہ دوست ہوں یا دشمن آپ سچی بات لکھ سکتے ہیں لیکن اسے مبالغے سے خالی ہونا چاہیے ——"

—— قاضی عبدالودود

فکروخیال

خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو ــــــ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے !؟

ــــــ غالب

خطوطِ غالب کے اَدوار

غالب (ولادت: آگرہ ۱۷۹۷ء) نے اُردو شعر گوئی سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا[1]
لیکن کس عمر میں کیا؟ اس سلسلے میں ان کے اپنے بیانات میں کسی قدر تضاد ہے۔ بمفتی سید محمد عباس
کے نام ۱۶- اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"پچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں۔"

[عود ہندی، طبع اول ۱۸۶۸ء، صفحہ ۱۷۱]

گویا ۱۸۰۷ء یعنی دس برس کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ شہزادۂ میسور سلطان محمد بہادر
کے نام ایک خط میں بھی غالب نے یہی لکھا ہے کہ دسویں سال میں موزونیِ طبع کے
آثار پیدا ہو گئے تھے:

"روشن ترک ایں کہ در دہ سالگی آثارِ موزونیِ طبع پیدائی گرفت"۔

[کلیاتِ نثرِ غالب، نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۱ء، صفحہ ۲۴۹]

---

[1] غالب نے "گلِ رعنا" (دسمبر ۱۸۲۸ء) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اوّل اُردو زبان میں شعر
کہنا شروع کیا تھا۔ غالب کی قلمی تحریر کے عکس کے لیے دیکھیے:

[اشاریۂ غالب، سید معین الرحمٰن، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۰۳]

دیوانِ فارسی (۱۸۴۵ء) کی تقریظ میں لکھتے ہیں :

" ازروزے کہ شمارۂ سنین عمراز آحاد فرا ترک رفت و رشتۂ حساب زحمت یازدہمین گرہ بخود برگرفت اندیشہ در رواروگام فراخ برداشت و گریوہ و مغاکِ بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد ... "

[دیوانِ فارسی، طبع اوّل، ۱۸۴۵ء، صفحہ ۵۰۴]

" دستنبو " (۱۸۵۸ء) میں ایک موقع پر غالب نے لکھا ہے کہ :

" امسال سرآغاز شصت و دومین سال ست .... و از پنجاہ سال در ورزش شیوۂ سخن جانگدازی میکنم ــ "

[دستنبو ، مالک رام، صدی ایڈیشن، دہلی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۹]

قدر بلگرامی کے نام ایک خط مرقومہ ۲۳۔ فروری ۱۸۵۷ء میں غالب نے یہ لکھا ہے کہ :

" بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ، مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کررہا ہوں ۔ "

[اُردوئے معلّٰی (ہر دو حصہ مع ضمیمہ)، طبع اول، لاہور، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۴۰۳]

قدر بلگرامی ہی کے نام اخیر عمر کے ایک خط میں یہ لکھتے ہیں کہ :

" پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں ۔ "

[اُردوئے معلّٰی، ایضاً، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۴۱۶]

مولوی عبدالرزاق شاکر کو بھی " پندرہ برس " ہی لکھا ہے :

" پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا ۔ "

[عودِ ہندی، طبع اول ۱۸۶۸ء، صفحہ ۱۵۹]

جو کم سے کم عمر خود انھوں نے بتائی ہے وہ " دس برس " ہے۔ " یادگارِ غالب " (طبع اول: ۱۰،

میں غالب کے اشعار کے بارے میں میر تقی میر کی رائے موجود ہے[۱۵]۔ جن کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا، اُس وقت غالب کی عمر تیرہ برس کی رہی ہوگی۔ "یادگارِ غالب" میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ غالب نے آٹھ نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا[۱۶]۔ یہ بہر حال طے ہے کہ آٹھ دس کی عمر میں موزونیِ طبع کے جو آثار پیدا ہوئے تو پھر اُن کی ساری عمر اسی شعبے کی ورزش میں گزری اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ اخیر دم[۱۷] (فروری ۱۸۶۹ء) تک جاری رہا۔

---

[۱۵] "خود میرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی میر نے جو میرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سُن کر یہ کہا تھا کہ: "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" مرزا (غالب) کی ولادت ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں واقع ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ مرزا کے اشعار ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم، والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی میر کو دکھائے تھے۔"

[حالی، یادگارِ غالب، انوار المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۸۲]

[۱۶] "منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے ایک بار دلی میں آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی۔"

[حالی، یادگارِ غالب، ایضاً، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۸۱]

[۱۷] مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" (طبع اوّل ۱۸۸۰ء) میں غالب کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے: "مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھتے رہتے تھے:

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

[آبِ حیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۹۷]

حالی نے بھی مرض الموت کی حالت کے تحت اس شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرنے سے پہلے اکثر وردِ زبان رہتا تھا۔"

[یادگارِ غالب، ایضاً، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۷۵]

Scanned with CamScanner

یہ ذکر، غالب کی اردو شاعری کا ہے جس کا زمانی دور پیش کردہ تفصیل کے مطابق گویا کم و بیش ساٹھ پینسٹھ برس پر پھیلا ہوا ہے۔ غالب شناسوں نے، غالب کے اس ساٹھ برس سے متجاوز شعری اکتساب کو ایک سے زیادہ ادوار میں تقسیم کیا ہے[۵]۔ اس امر میں بہرحال کوئی اختلاف نہیں کہ غالب کی شعری زندگی کا آخری دور غالب کی پختگیِ فکر کا زمانہ ہے۔

اُردو نثر میں غالب کا قابلِ ذکر سرمایہ اُن کے خطوط ہیں۔ حالی کا بیان ہے[۶] کہ:

مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے۔ سنہ مذکور کے بعد بوجوہ اُنھیں اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی"۔ حالی کا یہ بیان، اب سے قریب ۸۰، ۸۵ برس پہلے کا ہے۔ ان اسّی پچاسی برسوں میں اس بیان پر محض اتنا اضافہ ممکن ہوا ہے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو میں خط لکھنے کے بجائے ۱۸۵۰ء سے کوئی تین چار برس پہلے یعنی ۱۸۴۶ء میں اُردو خطوط نویسی کا آغاز کر دیا تھا۔

غالب کے دستیاب اردو خطوں میں قدیم ترین خط ۱۸۴۶ء کا ہے۔ یہ غالب کے ممدوح والیِ فرخ آباد نواب تجمل حسین خاں کے نام ہے اور اکتوبر ۱۹۷۵ء میں غالب کے اکیس[۲۱] نئے فارسی، اُردو خطوط کے ایک مجموعے کے ساتھ الٰہ آباد سے پہلی بار ہاتھ آیا ہے[۷]۔

غالب کا آخری نتیجۂ فکر، اس خط کو ماننا چاہیے جو حالی کی یادداشت کے مطابق غالب نے انتقال سے ایک دن پہلے، یعنی ۱۴۔ فروری ۱۸۶۹ء کو نواب علاء الدین احمد خاں علائی

---

[۵] (i) ڈاکٹر سید عبداللطیف، غالب (انگریزی) طبع ثانی، حیدرآباد دکن، اپریل ۱۹۲۹ء، صفحہ ۱۰-۲۴

(ii) ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ارمغانِ غالب، طبع اول، بمبئی، ۱۹۴۴ء، صفحہ ۱۰-۲۳

(iii) ڈاکٹر شوکت سبزواری، فلسفہ کلام غالب، طبع اوّل، بریلی، ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۰۶-۲۱۶

(iv) ڈاکٹر شوکت سبزواری، غالب کا فنی ارتقا، نقوش، لاہور، غالب نمبر۳، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۲۲-۲۳۰

[۶] یادگارِ غالب، ایضاً، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۱۲۹

[۷] مکتوب عرشی زادہ (رامپور) بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۲۔ نومبر ۱۹۷۵ء

کو لکھوایا تھا۔[۸]

اس طرح غالب کی اُردو خطوط نویسی کی مدّت، اردو شاعری کے ساٹھ پینسٹھ برس کے مقابلے میں صرف بیس برس ہے اور عمر کا یہ آخری دور، اُن کی پختگیِ فکر کا زمانہ ہے۔ گویا غالب نے شعر دس برس کی کچی عمر میں کہنا شروع کیے۔ قدرتی طور پر عمر اور علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ، اُن کے طرزِ اظہار میں ارتقائی شان پیدا ہوتی گئی اور ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے، اُن کے شعری سرمائے کو ادوار میں تقسیم کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ لیکن اُردو میں خطوط نویسی کا آغاز ہی اُنھوں نے پچاس برس کی پختہ کار عمر میں کیا۔ بلاغتِ فکر کی یہ وہ منزل تھی جس کے بعد کسی واضح ارتقائی تبدیلی کی گنجائش محال تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب "طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا چھوڑ کر" غالب اپنے رنگِ خاص کے مالک بن چکے تھے۔ اُن کے خطوط اسی ایک رنگِ خاص کے حامل ہیں اور شاید اسی لیے آج تک خطوطِ غالب کے ادوار قائم نہیں کیے گئے۔

پنڈت مہیش پرشاد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی[۹]، مولانا امتیاز علی خاں عرشی[۱۰] مولانا غلام رسول مہر[۱۱]، آفاق دہلوی[۱۲]، ڈاکٹر خلیق انجم[۱۳]، اور مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی[۱۴] نے غالب کے اُردو خطوں پر بڑا بنیادی کام کیا ہے۔ لیکن ان بزرگوں میں سے کسی نے بھی غالب کے خطوں کی دَور بندی نہیں کی۔ مَیں بوجوہ غالب کے اُردو خطوں کو جو

---

۸ یادگارِ غالب۔ ایضاً، ۱۹۲۲ء صفحہ ۷۴-۷۵

۹ خطوطِ غالب، مرتبہ: مہیش پرشاد، نظرِ ثانی: ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، الٰہ آباد، ۱۹۴۱ء

۱۰ مکاتیبِ غالب: مولانا امتیاز علی خاں عرشی، بمبئی ۱۹۳۷ء

۱۱ (i) خطوطِ غالب (دو جلدیں) مولانا غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۱ء
(ii) خطوطِ غالب (ایک جلد) مولانا غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۶۸ء
(iii) خطوطِ غالب (دو جلدیں) مولانا غلام رسول مہر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۲ نادراتِ غالب، آفاق دہلوی، کراچی، ۱۹۴۹ء

۱۳ غالب کی نادر تحریریں، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۱ء

۱۴ (i) عودِ ہندی مرتبہ: فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۶۷ء (ii) اُردوئے معلیٰ (تین جلدیں) مرتبہ فاضل لکھنوی، لاہور، ۷۰-۱۹۶۹ء

۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۹ء تک کوئی بیس برس کا اکتساب ہیں، وہ الگ الگ ادوار میں تقسیم کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک حدِ فاصل وسط نومبر ۱۸۵۸ء ہے۔

"غالب کے خطوط اپنے طرز کی بے نظیر چیز ہیں.... انھیں تصنع اور آورد کی ہوا تک نہیں لگی.... یوں معلوم ہوتا ہے، کوئی سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔"[۱۵]

خطوطِ غالب کے بارے میں یہ بات کم و بیش غالب پر ہر عام و خاص لکھنے والے نے دہرائی ہے کہ یہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں۔ یہ بات نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے کے خطوں کے بارے میں تو صحیح کہی جا سکتی ہے لیکن اس کے بعد کے خطوں کے بارے میں یہ بات درست نہیں۔ وسط نومبر ۱۸۵۸ء میں منشی شیونرائن آرام نے جو آگرے میں ایک مطبع کے مالک اور غالب کے شاگرد تھے، غالب کے اُردو خطوط چھاپنے کا ارادہ کیا تو غالب کے لیے یہ قطعی نئی اور زائد بات تھی۔ انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح لفظوں میں شیونرائن کو لکھا کہ:

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے، کوئی رُقعہ ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے، اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔"[۱۶]

یہ پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کا خط ہے۔ اُردو خطوں کی اشاعت کی اس تجویز میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی، شیونرائن کے شریک تھے اور بضد تھے کہ خط ضرور چھاپے جائیں۔

---

[۱۵] ذکرِ غالب، طبع پنجم، دہلی، ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۰۹-۲۰۸

[۱۶] اُردوئے معلّٰی، طبع اول، دہلی، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۶۱

۲۰- نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ :

" رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے - لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب، مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے - یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"[۱۰]

اسی روز یعنی ۲۰- نومبر ۱۸۵۸ء کو ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے منشی شیونرائن کو لکھا کہ :

" رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔"[۱۱]

ظاہر ہے کہ وسط نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے غالب نے جو خط لکھے، اُن کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام و کمال بے تکلف اور معصومانہ ہیں کیونکہ وہ اس احساس کے بغیر لکھے گئے کہ وہ کبھی چھپیں گے بھی۔ لیکن رقعات کے چھاپنے کی تجویز سامنے آنے کے بعد، جسے ہر چند ابتداً غالب نے رد کر دیا، غالب اپنے خطوں کی اشاعت ضرور "ممکن الوقوع" سمجھتے ہوں گے - اسی لیے میں وسطِ نومبر ۱۸۵۸ء کو حدِ فاصل قرار دے کر خطوطِ غالب کے دو ادوار قائم کرتا ہوں :

پہلا دور : ۱۸۴۶ء یا ماقبل سے وسطِ نومبر ۱۸۵۸ء تک قطعی بے تکلف خطوط : جنہیں غالب نے "تحریرِ سرسری" کہا ہے -

دوسرا دور : وسط نومبر ۱۸۵۸ء کے بعد سے اخیر عمر ۱۸۶۹ء تک کے مکاتیب، جنہیں غالب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہے -

---

[۱۰] اُردوئے معلّیٰ، طبع اوّل، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۰۵

[۱۱] اُردوئے معلّیٰ، طبع اوّل، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۶۱

غالب کے طالب علموں کے لیے یہ بات نئی نہیں ہو گی لیکن ہے ضرور دلچسپ کہ غالب جنھوں نے رقعات کے چھاپنے کی اوّلین تجویز کو بڑے شد و مد سے رد کر دیا تھا، بالآخر تجویز کے ہمنوا ہو گئے اور مکاتیب کی اشاعت پر نہ صرف آمادہ ہوئے بلکہ انھوں نے مختلف جامعین اور مرتّبین کی طرح طرح سے مدد کی۔ احباب اور شاگردوں سے اپنے خطوں کی نقلیں منگائیں۔ اپنے تازہ خطوں کی نقلیں رکھنا شروع کیں۔ اپنے لائق اشاعت خطوں کی نقلیں مرتّبین کو بھیجی اور بھجوائی جانے لگیں، یہاں تک کہ خود اپنے خطوں کی اشاعت کے دن گنے جانے لگے۔

[میں یہاں ساری متعلقہ شہادتوں کو چھوڑتا ہوں اور بالاختصار عرض کرتا ہوں کہ:]
غالب کی زندگی میں ان کے خطوں کے دو مجموعے "عودِ ہندی"[۱۹] اور اُردوئے معلیٰ[۲۰] ترتیب دیے گئے۔ "اُردوئے معلیٰ" کی بعد کی اشاعتوں میں متعدد خطوں کا اضافہ ہوا۔[۲۱] رامپور سے متعلق غالب کے خطوں کا ایک بالکل نیا مجموعہ "مکاتیبِ غالب"[۲۲] کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے خطوں کا ایک بے حد اہم مجموعہ "نادراتِ غالب"[۲۳]

---

۱۹ عودِ ہندی، مرتبین: خواجہ غلام غوث بے خبر، چودھری عبدالغفور سرور، منشی ممتاز علی حسان، طبعِ اول: مطبعِ مجتبائی، میرٹھ، ۲۷- اکتوبر ۱۸۶۸ء، صفحات ۲۶۴

۲۰ اُردوئے معلّیٰ، مرتبین: منشی جواہر سنگھ جوہر، میر فخرالدین، لالہ بہاری لال مشتاق، طبعِ اول: اکمل المطابع، دہلی، ۶- مارچ ۱۸۶۹ء، صفحات ۱۸۸

۲۱ ۱۸۹۹ء میں مطبعِ مجتبائی، دہلی سے "اُردوئے معلّیٰ" حصّہ دوم کے اضافے کے ساتھ شائع ہوئی، حصّہ دوم ۵۳ خطوط پر مشتمل ہے، یہ مواد مولانا الطاف حسین حالی نے فراہم کیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں "مکمل اُردوئے معلّیٰ (ہر دو حصّہ) مع ضمیمہ" کے عنوان سے کتاب شیخ مبارک علی کے اہتمام سے مطبع کریمی، لاہور میں چھپی، اس میں ۲۵ خطوں کا اضافہ ہے۔

۲۲ مکاتیبِ غالب، مرتبہ: مولانا امتیاز علی خاں عرشی، بمبئی، ۱۹۳۷ء، صفحات ۱۸۳ + ۱۳۵

۲۳ نادراتِ غالب، مرتبہ: آفاق دہلوی، کراچی ۱۹۴۹ء، صفحات ۱۸۰ + ۱۶۰

کے نام سے شائع ہوا۔ ایسے بہت سے خط جو وقتاً فوقتاً غالب شناسوں کی کوشش سے رسائل وغیرہ میں شائع ہوتے رہے اور کسی مستقل مجموعے میں شامل نہیں تھے، "غالب کی نادر تحریریں"[۲۶] کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیے گئے۔

خطوطِ غالب کے ان مختلف مجموعوں میں خطوں کی تعداد میرے شمار کے مطابق تخمیناً ۸۸۰ ہے۔ ان میں سے ۴۰ کے لگ بھگ خط ایسے ہیں جن پر تاریخ درج نہیں اور جو کسی دوسری شہادت کی بنا پر بھی کسی ایک دور سے متعلق نہیں کیے جا سکتے۔ بقیہ ۸۴۰ خطوں میں سے کم و بیش ۲۴۰ خط میرے قائم کردہ پہلے دور سے متعلق ہیں۔ یعنی پہلے دور کے قریب دس برسوں میں لکھے گئے، غالب کے محفوظ خطوں کی تعداد ۲۴۰ ہے۔ یہ وہ خط ہیں جنہیں غالب نے "تحریرِ سرسری" قرار دے کر، ان کی اشاعت سے گریز کیا تھا۔ ۶۰۰ خط دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی غالب کے یہ خط ایسے ہیں جو آخری دس برس میں اس شعور کے بعد اور اس احساس کے ساتھ لکھے گئے کہ یہ کبھی منظرِ عام پر بھی آ سکتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ ان خطوں کو غالب نے کسی قدر قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا اور یہی وہ خط ہیں جن کی اشاعت کو وہ اپنی سخنوری کی شہرت کے منافی خیال نہیں کرتے تھے۔

پہلے دور سے بے تکلف اظہارِ خیال کی مثال دیکھیے: غالب پر انکم ٹیکس کی رقم کا بار اچانک آن پڑا، لیکن یک مشت ادائی کے بجائے تا ادائے زر ماہوار قسط مقرر ہو گئی۔ مرزا ہرگوپال تفتہ نے ماہوار قسط کا زیادہ اندازہ لگایا ـــــ غالب اس پر لکھتے ہیں:

"بھائی! تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپے کا نوکر یا پنشن دار قرار دیا ہے جو دس بیس روپیہ مہینا قسط کی آرزو رکھتے ہو؟ تمہاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔ اگر احیاناً تم کبھی دلّی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہوتے تو تم کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہرحال خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپیہ مہینا پنشن

---

[۲۶] غالب کی نادر تحریریں۔ مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی ۱۹۶۱ء۔ صفحات ۱۸۴

انگریزی میں سے قسط مقرر ہوگیا ہے تا ادائے زر۔ ابتدائے جون ۱۸۵۳ء،
یعنی ماہ آئندہ میں سے یہ قسط جاری ہوگی ۔" [مئی ۱۸۵۳ء]

تفتہ کے نام پہلے دور ہی کے ایک خط کا ٹکڑا دیکھیے :

"یہ تمہارا دُعا گو اگرچہ اور اُمور میں پایہ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بُجھتی۔ تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ بے پورے اگر مجھ کو دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے، سو وہ میرے صرف میں آویں گے ـــــ"
[۹ جون ۱۸۵۳ء]

۱۸۵۸ء کے نصف اوّل، یعنی خُطوطِ غالب کے پہلے دور کے ایک خط بنام تفتہ سے ایک مثال اور :

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دُکھ مُجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان "روسیاہ کالوں" کے ہاتھ سے قتل ہوئی، اُس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ـــــ ہندوستانیوں میں : کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کی زیست کیوں نہ دشوار ہو؟"

شخصیت کا اظہار، اختصار، ایجاز، ترسیلِ خیال، بیان اور بدیع کی قوت، معنی کی کثرت، الفاظ کی تقلیل، غرض مدعا، مؤثر اور بے تکلف طرزِ ادا کی خوبیوں سے

مُتصف، یہ اسلوب خیال انگیز بھی ہے اور خیال افروز بھی ——

اب، دوسرے دور کے اوائل سے خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام غالب کے خطوں سے کچھ تراشے دیکھیے:

"یہ خط ہے یا کرامت؟ صاف صفائے ضمیر و کشفِ مجب کی علامت ہے۔ مدعا ضروری التحریر اور اندیشہ نشاں مسکن دامنگیر اگر یہ خط کل نہ جاتا تو آج خط کیوں کر لکھا جاتا؟ سُبحان اللہ! جس دن یہاں مجھ کو مطلب خطیر درپیش آیا ہے، اُسی دن آپ نے وہاں لکھنے کو قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کو عارفِ کامل کیوں کر نہ کہوں؟ اور کیا کہوں، ولی اگر نہ کہوں؟ مدعا بیان کرتا ہوں، مگر یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ خط پہنچنے نہ پائے گا کہ وہ رازِ سربستہ آپ پر کھُل جائے گا ——" [۲، دسمبر ۱۸۵۸ء]

○

"میں اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے مُدعا کا گزارش کرنے والا کون؟ ..... نذر ولایت کی ولایت کو روانی ہوئی یا نہیں؟ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں؟ پیش گاہِ حکام سے موافق دستور قدیم کے خط کا اُمید وار رہوں یا نہیں؟ اپنے حُسن طبع کا شکر گزار رہوں یا نہیں؟ اس خط کا جواب جتنا جلد عنایت کیجیے گا، مجھ کو جِلا لیجیے گا ——"

[دسمبر ۱۸۵۸ء]

○

"کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے؟ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوحِ جدید کا آرزو مند۔ اس پنشن کا احاطہ پنجاب کے

حکام پر مدار ہے، سو ان کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب۔
نہ مہربانی کرتے ہیں، نہ عتاب۔ خیر ان سے قطع نظر کی، اب سُنیے ادھر کی ـــ"

[۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء]

بقیدِ ادوار غالب کے خطوں کا باعتبارِ اسلوب اور بلحاظِ موضوع مطالعہ کیا جائے تو غالب کی شخصیت کے متعدد گوشے سامنے آتے ہیں اور ان کے فکر وفن پر ایک نئی روشنی ملتی ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ میں نے ادوار کی خود قائم کردہ حد بندی کے ساتھ خطوطِ غالب کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔[۲۵]

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بیان کی جو بے تکلفی خطوطِ غالب کی سب سے بڑی اور بنیادی خوبی مانی گئی ہے، دوسرے دور کے خطوط، اس خوبی سے کسی قدر خالی ہیں خصوصیت کے ساتھ دوسرے دور کے بالکل اوائل میں جب تازہ بہ تازہ یہ بات، غالب کے احاطۂ شعور میں آئی تھی کہ اُن کے خط چھپیں گے بھی، انھوں نے بطریقِ انشا پردازی، عبارت آرائی کی ہے، آرائشِ گفتار سے کام لیا ہے اور اپنی تحریر کو طرح طرح کے شاعرانہ وسیلوں سے سجایا اور سنوارا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوستوں کو خط لکھ رہے ہیں۔ یہ احساس ہے کہ خط چھپیں گے، داد ملے گی۔ اس لیے مگن اور مسرور ہیں۔ دل کثرتِ نشاط سے گُل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت راہ دیتی ہے، الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ طرزِ جدید، پھر حُسنِ معانی اور صنعتِ الفاظ، بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ !!

بحیثیتِ مجموعی غالب کے اُردو خطوط ایک مُستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں اور اب کہ ہم مطالعۂ غالب کی دوسری صدی میں سانس لے رہے ہیں، ان خُطوط کے ایک منظم سلسلے اور منصوبہ بند مطالعے کی ضرورت پر زور دینے کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔

---

۲۵ زیرِ طبع۔ نذر سنز پبلشرز، ۲۲۱۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

غالب کا شعری رویّہ

۱۸۵۷ء کے پس منظر میں

"فتح دہلی کے بعد جو عالمگیر و عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیانِ شہر پہ نازل ہوئی اور جس طرح شاہجہان آباد کی ان سڑکوں پہ جہاں کبھی صاحب قرانِ اعظم کی سواری کے لیے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظر خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا جو عرصے تک دارالخلافے کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں:

فلا تسئلن عما جری یوم حصرھم
و ذالک مما لیس یدخل فی حصر[1]

علی الخصوص قلعۂ معلّٰی کی بربادیاں جن کے لیے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشکبار ہوجاتیں اور جن کے غم میں آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی اُن کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجساد محترمہ و رفیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبرِ اعظم و صاحب قرانِ ثانی کے خونِ عظمت و جبروت کے حامل تھے جنہوں نے چھ صدیوں سے متّصل شہنشاہی و فرماں روائی کی گود میں پرورش پائی تھی جنہیں حکومت و اجلال

---

[1] ترجمہ: "ان کی محصوری کے دن جو کچھ پیش آیا اس کے بارے میں نہ پوچھو۔ یہ وہ امور ہیں جو شمار میں نہیں آسکتے ہیں۔"

کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا اور جو ہمیشہ ان کروڑوں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوہستانوں سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے ــــ کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور اُن کی لاشیں اُس عظمت رفتہ کا ماتم سُنائیں، جو چند روز پیشتر دنیا میں صرف ان ہی کے لئے تھی ......

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے، اور دیکھتے رہے۔ یہ وہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں، ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اُس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں[۲]۔ ــــ ابوالکلام آزاد

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بہت سخت واقعہ سہی، لیکن ہمارے ادبی اور تہذیبی اُفق کا یہ المیہ بھی بجائے خود کچھ کم تلخ حقیقت نہیں کہ "مرزا غالب جیسے غم دوست" شاعر نے "یہ سب کچھ دیکھا" لیکن یہ سب کچھ ان کا شعری تجربہ نہیں بن پایا ــــ

⊙

مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں :

" مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اردو تصانیف نظم و نثر میں (۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں) پر جو کچھ لکھا، اگر اُسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم مجلد تیار ہو جائے[۳] "

---

[۲] الہلال کلکتہ، ۱۸ جون ۱۹۱۳ء بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۵۹-۶۱
[۳] " " نور کراچی، فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳

فارسی نثر میں اس موضوع پر غالب کی ایک مستقل کتاب ہے "دستنبو" یہ سراسر انگریز حکام کی تائید و تحسین میں ہے اور ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی ہے، اس لیے اس کے مندرجات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انگریزوں سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت پر صرف ہوا ہے۔ فارسی نظم میں غالب کا آخری مجموعہ "سبدِ چین" "مطبع محمدی" دہلی سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ/ اگست ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ، غالب کے ان فارسی اشعار پر مشتمل ہے جو "کلیاتِ غالب" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا اس کی طباعت (۱۸۶۳ء) کے بعد موزوں ہوئے۔ چالیس صفحات کے اس مختصر سے مجموعے میں دو قصیدے، ایک ترجیع بند، چھ قطعات تین رباعیاں اور مفرد اشعار کا اسّی فیصد سے متجاوز حصہ انگریز حکام کی شان میں ہے۔ حامد اللہ ندوی نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"غالب کی ان قصیدہ خوانیوں کے مقصد کو پانا کچھ مشکل نہیں۔ غالب ایک بڑے شاعر تھے۔ دلی کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا، وہ بہادر شاہ کے نمک خوار رہ چکے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزوں کی نظر میں اُن کا مشتبہ ہونا کچھ بعید نہ تھا۔ ... غالب کے لیے ضروری تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کرتے جس سے انگریزوں کے دل سے اس شک و شبہ کو دور کرنے میں مدد ملتی اور اس کے لیے قصیدوں سے اچھا اور کون سا ذریعہ ہو سکتا تھا، چنانچہ اُنھوں نے یہ قصیدے لکھے اور ان کو خاص اہتمام سے شائع بھی کیا۔ اس طرح "سبدِ چین" کو غالب کی فارسی میں وہی درجہ حاصل ہے، جو اُن کی فارسی نثر میں "دستنبو" کو۔"[۱۱]

یہ دونوں کتابیں تاریخی اہمیت کی حامل ضرور ہیں، لیکن حاشئہ تلی سے خالی ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام ۲- فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے دلی کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے

---

[۱۱] شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۲۱

لکھا ہے کہ :

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

یہ شعر غالب کے انتقال سے کوئی ساڑھے تین ماہ پہلے "عود ہندی" میں شائع ہوا (عود ہندی، طبع اول، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء، صفحہ ۴۴) اس واقعاتی شعر کے علاوہ، جو دیوانِ غالب سے خارج ہے، اردو نظم میں، غالب کے ہاں واقعۂ ستاون سے متعلق محض ایک نو شعری قطعہ ملتا ہے۔ یہ ۵۸ء کے ایک خط بنام علائی میں محفوظ ہے،

بسکہ فعّال ما یُرید[1] ہے آج	ہر سلحشور[2] انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک	تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک	آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ	سوزشِ داغہای نہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم	ماجرا دیدہ ہای گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یا رب	کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۸ء کے بعد غالب کا اُردو دیوان ان کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوا[3] لیکن اس قطعے کو دیوان کی کسی اشاعت میں جگہ نہ ملی۔ یہ قطعہ اُن کے انتقال کے معاً بعد مارچ ۱۸۶۹ء

---

[1] مختارِ کل [2] سپاہی

[3] تفصیل کے لئے دیکھیے : اشاریۂ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۷۹ - ۸۲

میں، "اُردوئے معلّیٰ" کے ذریعے پہلی بار سامنے آیا[۸] ــــ اس ایک استثنیٰ کے علاوہ غالب کے کلام میں ہمیں ۱۸۵۷ء کے دل دوز سانحے کا کوئی تاثر نہیں ملتا ــــ اور یہ اتنی غیر معمولی بات تھی کہ خود غالب کی زندگی میں سوال بن کر زبان پہ آگئی تھی۔ غالب نے اس کا اچھا جواز پیش کیا ہے:

"ارے بھئی! مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں، نوحہ کیجیے تو دو کا کیجیے، جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے[۹] ....."

"وفورِ احساس" بھی اس کا باعث ہو سکتا ہے، اسے بے بضاعتی اور بے حسی یا لاتعلقی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، سبب خواہ کچھ بھی رہا ہو، واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ، غالب کے ہاں شعری تجربہ ہی نہیں بنا ــــ انقلاب کے زمانے میں اور اس کے بعد تا آخر، غالب کا رویہ جدوجہدِ آزادی سے کسی جذباتی لگاؤ کو ظاہر نہیں کرتا ــــ اس صورتِ حال میں طرف دارانِ غالب کی یہ "وکالت" کچھ حقیقت نہیں رکھتی کہ گو غالب نے:

"۱۸۵۷ء کی تباہی پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن متفرق طور پر ان کے کلام میں ..... اس داستانِ الم کی جو تفاصیل اور اشارات ملتے ہیں وہ کسی پُر درد مرثیے سے کم نہیں اور یہ اشارات اتنے واضح اور تفاصیل اتنی کافی ہیں کہ ہم مرثیے کے عدم وجود کا شکوہ نہیں کر سکتے۔[۱۰]"

۱۸۵۷ء کے بعد سے غالب کے آخر عمر تک کے کلام پر نظر ڈالیے تو اس میں ہمیں ستاون کی داستانِ الم کا کچھ انعکاس نہیں ملتا ــــ نہ کوئی داد، نہ اس کی طرف اشارہ، نہ اس کی کوئی تفصیل ــــ "فتنہ و فساد کا یہ اثر سرزد ہوا کہ ذوقِ شعر، گویا جاتا رہا اور شعر گوئی ایک

۸؎ اُردوئے معلّیٰ، طبع اوّل، اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۴۱

۹؎ سیر دہلی، شیخ محمد ریاض الدین امجد، مطبع حیدری، آگرہ، ۱۸۶۱ء، ص ۲۴ بحوالہ احوالِ غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۵۳ء، ص ۳۰

۱۰؎ ابو سلمان شاہجہاں پوری، العلم، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۵

طرح سے ترک ہی کر دی، لیکن کچھ کہا تو اپنی مدافعت اور نئے نظام کی مدحت میں!

○

"دلی کا وہ ادبی حلقہ جس کو مرزا غالب سے ذہنی اور فنی بیر تھا، ۵۷ء
کی بغاوت میں پیش پیش رہا ـــ مولوی محمد باقر، ایڈیٹر اُردو اخبار دہلی
ـــ جنھوں نے ۱۸۴۷ء میں مرزا کی گرفتاری پر تغلیس بجائی تھیں اور
کوتوال کی حمایت کی تھی، مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو برطانوی اقتدار کا
خاتمہ اور مغل شہنشاہی کی بحالی سمجھ رہے تھے ـــ پھر یہ کہ باغی فوج میں
تنظیم کی کمی، سرشوری کی زیادتی اور اُن انگریزوں کا قتلِ عام جن میں کوئی
غالب کا دوست تھا، کوئی اُمیدگاہ تھا، کوئی قدردان تھا، کوئی مربی تھا۔
اور اس کے سوا یہ بھی کہ غالب کو نظر آرہا تھا کہ آخر یہ بغاوت یا جنگِ آزادی
خود اپنی کمزوریوں کی بدولت ناکام ہونے والی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے در پردہ
اپنے ایک دوست اور اُمیدگاہ والیٔ رام پور کو جو خفیہ خط لکھے اور سیاسی
مشورے دیے، ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کو باغیوں سے ویسی ہمدردی
نہ تھی جیسی ان کے طبقے کے دوسرے سربرآوردہ لوگوں کو رہی، چنانچہ ہندوستانی
تاریخ کے اس عظیم الشان واقعے پر جو آنسو ہم ان کی تحریروں سے چنتے ہیں،
اُن میں غم تو ہے آگ نہیں ہے، مرنے والوں سے چاہے وہ کالے ہوں یا
گورے اور لٹنے والوں سے چاہے وہ غریب ہوں یا امیر، اُن کو گہری ہمدردی
ہے۔ ماتم سب کا ہے لیکن کسی فریق کی حمایت یا تائید بالاعلان نظر نہیں آتی۔"[۱۱]

ـــ ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کے تعلقات: "حکام انگریزیہ سے ابتدا سے خوشامدانہ تھے۔ اُن کا

---

[۱۱] شاعر، بمبئی، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۵۹۶-۵۹۷

وظیفہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کم بخت وظیفے کو واگزار کرانے کے لیے انھیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح میں اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر و جہانگیر کی مداحی ہو رہی ہے۔ پھر وقت بھی ایسا پُر آشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا اور سولی کے تختے اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ بڑی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے[۱۲]..." —— ابوالکلام آزاد۔

"ہندوستانی زبان کے علاقے کی قومی بغاوت سے غالب کی یہ بیگانگی اور بغاوت کی ناکامی پر انگریز گورنروں اور افسروں کے سامنے اپنے رویّے کی صفائی دیتے پھرنا، بظاہر ایک ایسے شاعر کے لیے نازیبا معلوم ہوتا ہے جو دربارِ شاہی کا منصب دار ہو اور اشرافیہ میں اعلیٰ مقام رکھنے کا آرزومند ہو —— جس کے کلام میں جابجا آزادی اور آزادہ روی کے دعاوی پائے جاتے ہوں اور جس نے بغاوت شروع ہونے تک بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی تعریف میں پے در پے فارسی قصائد لکھے ہوں اور جاں نثاری کے دعوے کیے ہوں۔ لیکن اس بباطن بیگانگی اور بظاہر آشنائی کے پیچھے، جہاں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اقتدار پسند طبقے کی وفاداریاں سو سال پہلے سے بٹ چکی تھیں، غالب کے ددھیالی اور سسرالی خاندانوں میں بھی یہ رسم چلی آ رہی تھی —— وہاں اس حقیقت پر بھی نظر جاتی ہے کہ واقعہ چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، وہ کسی وقت بھی ہوش و حواس سے بے بہرہ نہیں ہوئے[۱۳] ——"

یہ صحیح ہے کہ ضرورت و احتیاج نے انھیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر

---

۱۲ الہلال، کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۲ء، بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء ص ۶۲-۶۳

۱۳ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر بمبئی، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۵۹

گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے نظم و نثر میں لکھوائے تھے۔ تاہم مرزا صاحب "مشفق و مہربان"
کے خطابات اور ساٹھ ستر روپے کی پنشن اور خلعت، اُس زخم کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا
جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان، وقت اور احتیاج
سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و
جذبات مٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر جس
کو دیکھ کر بڑے بڑے غدار و ملت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی[۱۴]"

لیکن ۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور
اصلی و حقیقی محسوسات شعری پیکر میں نہیں ڈھلے۔ ان کا اظہار تو کچھ اُن کے خطوں میں ہوا ہے،
جو اس موضوع پر غالب نے زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی۔ خطوں
میں انقلاب ستاون سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات اور اُن کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا
ہے ـــــــ اشعارِ غالب، اس سے یکسر خالی ہیں ـــــ اس امر پر اصرار کہ کلامِ غالب
میں اس داستانِ الم کی تفاصیل محفوظ ہیں، کسی طرح درست نہیں۔ اہلِ علم نے کلامِ غالب سے
اس نوع کے نتائج، اُس صورت میں نکالے ہیں، جب اُنھوں نے غالب کے اشعار کو صحیح تناظر
میں نہیں دیکھا اور شاعر کے کلام کا مطالعہ تاریخی اور زمانی ترتیب سے نہیں کیا۔

○

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اس کے اثراتِ مابعد کے بارے میں کلامِ غالب سے استشہاد
کی روایت پٹنہ کے ڈاکٹر سید محمود[۱۵] (سابق وزیرِ تعلیم، بہار، انڈیا) نے ڈالی۔ انھوں نے

---

[۱۴] الہلال، کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء، بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، ایضاً ص ۹۲

[۱۵] ڈاکٹر گیان چند کو التباس ہوا ہے کہ "یہ ڈاکٹر سید محمود، سر سید کے صاحبزادے تھے۔
(i) صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۰
(ii) رموزِ غالب، مکتبۂ جامعہ، دہلی، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۳۱۷

۱۹۱۹ء میں دیوانِ غالب، نظامی ایڈیشن پر ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا اور دو برس بعد ۱۹۲۱ء میں نظرِ ثانی کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ ڈاکٹر سیّد محمود نے بارہ تیرہ صفحات (ص ۶۳-۷۵) محض اس بحث کے لیے وقف کیے ہیں کہ "انقلاب ستاون کا غالب کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ سیاسی خیالات سے بے بہرہ نہیں تھے، انھیں ملکی و قومی تباہی کا بھرپور احساس تھا۔" اپنے اس موقف کی تائید میں ڈاکٹر سیّد محمود نے غالب کے تیس سے زیادہ اردو اشعار پیش کیے ہیں ــــــ لیکن اس نکتہ آفرینی کی کچھ حقیقت اور وقعت باقی نہیں رہتی جب یہ معلوم ہو کہ غالب کے جن اشعار کو سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ بیشتر ۱۸۵۷ء سے ۳۵ تا ۴۱ سال پہلے کے ہیں جب غالب کی عمر ۱۸ سے ۲۴ سال کی رہی ہو گی۔ ان اشعار میں سے کسی ایک کا بھی انقلاب ستاون سے کچھ تعلق نہیں ــــ اگلے صفحات میں ڈاکٹر سیّد محمود کے مقدمہ[۱۶] کے متعلقہ اقتباسات و اشعار کو راقم الحروف کے حواشی کی روشنی میں ملاحظہ کیجیے:

"اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔ میرے عزیز دوست سیّد راس مسعود صاحب ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں، جن میں انھوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرزِ حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں"

مجھے اس سے انکار نہیں، لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرزِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے، اس لیے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا صاحب کے اشعار اور عبارتیں نقل کر دی ہیں، تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے۔ ان کو اپنے ملک کی مٹی ہوئی عظمت

---

۱۶ مقدمۂ اُردو دیوانِ غالب مع شرح، نظامی پریس، بدایوں، طبع ششم، ۱۹۲۷ء، ص ۹۰-۴۰

کا کتنا گہرا احساس تھا۔ ۔ ۔ ۔ غالب نے کچھ تو اس زمانے کے حالات کے اعتبار کے باعث اور کچھ خود اردو شاعری کے خاص طرزِ بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو ۔ ۔ ۔ تعجب کا کیا مقام ہے ۔" (مقدمہ: ۴۴)

"اُس زمانے میں جو حالات تھے اُس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کرنے سے وہ معذور تھے اور مجبوراً ایسے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں ہی میں کر سکتے تھے چنانچہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں" اور پھر کہتے ہیں :

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع[۱۷]

اور پھر کہتے ہیں :

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے[۱۸]

ایک اور جگہ جتایا جاتا ہے :

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے[۱۹]

(مقدمہ: ۴۲)

---

[۱۷] بیاضِ غالب (نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۳، ص ۱۳۴، ۱۳۵۔ نسخۂ عرشی زادہ: دہلی ۱۹۶۹ء ص ۳۴) میں یہ شعر موجود ہے۔ یہ بیاض خود غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں مرتب ہوئی۔ ظاہر ہے یہ شعر ۱۸۵۷ء کی ملکی تباہی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

[۱۸] یہ شعر، نسخۂ رامپور ۱۲۳۸ھ/۱۸۳۳ء میں موجود ہے (نسخۂ عرشی ص ۲۴۳) اسے بھی ۱۸۵۷ء کی تباہی سے کوئی نسبت نہیں۔

[۱۹] یہ شعر نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) میں شامل ہے۔ دیکھیے نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۲

"ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بہ حیثیت ایک قوم کے، ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے سے پہلے ہو چکا تھا اور اس وقت کے شعرا اور صاحبانِ سیاست دونوں نے اسے محسوس کیا اہلِ سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ ہوا اور شعرا نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس گہرا تھا اور اُنھوں نے نہایت پر درد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے:

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں[۴۰]

پھر کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے[۴۱]

(مقدمہ، ص ۲۲-۲۳)

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلی اور نواحِ دلی پر جو آفتیں ٹوٹیں، اُنھوں نے ہزارہا بندگانِ خدا کو بے خانماں اور تباہ کر دیا۔ شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے دلی اُجڑ گئی اور شرفا کے مکان ویران و برباد کر دیے گئے .... ان واقعات کو مرزا غالب نے بچشمِ خود دیکھا تھا، غالباً اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

---

[۴۰] ۲۲ شعبان ۱۲۶۶ھ / ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو غالب قلعۂ معلّٰی سے متعلق ہوئے۔ شاہِ دہلی نے اُنھیں خطاب اور خلعت دیا اور سلاطینِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی تو غالب نے طرزِ تازہ پر ایک غزل لکھی (دیکھیے: مکاتیبِ غالب عرشی، طبع دوم، متن ص ۲۵) یہ شعر اسی غزل کے ہیں۔ ہنگامۂ ستاون، ان اشعار کے کہے جانے کے سات برس بعد وقوع میں آیا۔ اس لیے ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کا پُر درد نوحہ خیال کرنا، جنسی کی بات ہے۔

[۴۱] یہ شعر بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۲۲۴-۲۲۵۔ نسخۂ عرشی زادہ ص ۸۹) یعنی ہنگامۂ ستاون سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا!

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں[۲۱]

(مقدمہ : ص ۳۴)

"اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، اُن پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں..... خاص کر مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، وہ ناقابلِ بیان ہیں، مرزا لکھتے ہیں :

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا[۲۲]

(مقدمہ : ص ۳۵-۳۶)

" جو مصائب اہلِ ہند پر ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے اور پھر اس کے بعد نازل ہوئے، وہ

---

۲۱ یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے۔ دیکھئے : نسخۂ شیرانی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء ورق ۴۲ ب (حاشیہ) — اس لیے یہ یقیناً ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق نہیں۔

۲۲ یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ میں دیکھے جا سکتے ہیں (ص ۱۴۳)۔ مقطع، بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں شامل ایک غزل کے مقطع (نقوش، ص ۹۶-۹۰، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۷۵) کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۳۵، ۴۰ برس پہلے کے ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ۱۸۵۷ء میں "اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں اُن پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں" یا یہ اصرار کرنا کہ ان اشعار میں "اُن مظالم" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں خاص کر مسلمانوں پر توڑے گئے، کسی طرح صحیح نہیں۔

بجائے خود آئندہ کے لیے ایک سبق تھے، جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہے اور اُن کی خواہش ہے کہ ان کے ہم وطن، اُن سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبہ ہوں :

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلیِ استاد نہیں [۲۴]

(مُقدمہ : ۳۶)

"دلّی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہلِ دہلی نے بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کر لی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے لیکن حکامِ انگریزی کا جوشِ انتقام کم نہ ہوا۔ ہنگامے کے حالات ان کو فراموش نہ ہوئے۔ لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ اُمراء کی جاگیریں ضبط ہوئیں۔ غربا کے مکانات مسمار کر دیے گئے۔ مرزا ان حالات کا ذکر شکایت کے پیرایہ میں یوں کرتے ہیں : .....

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں [۲۵]"

(مُقدمہ : ۳۶)

---

[۲۴] یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۴۳ - ب پر موجود ہے، یعنی ۱۸۵۷ء سے تیس سال سے بھی پہلے کا ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ حکم لگانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اور اس کے بعد اہلِ ہند پر جو مصائب نازل ہوئے" غالب نے اُنھیں خوبی سے شعر میں ادا کیا ہے؟ یا یہ کہ غالب کی خواہش یہ تھی کہ اُن کے ہم وطن اُن مصائب سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبہ ہوں۔ ؟؟"

[۲۵] یہ شعر بھی نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے (ورق ۴۲ ب) اس لیے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ اس میں اُس ہنگامے کے حالات کا ذکر شکایت کے پیرائے میں ہوا ہے جو بجائے خود اس شعر کے کامل اکتیس برس بعد ظہور پذیر ہوا۔

"ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں : "بھائی بُری آ بنی ہے"..... اور پھر جو سزائیں دی گئیں، ان کی سختی کی گویا یوں شکایت کرتے ہیں :

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں[۳۴] "

(مُقدمہ : ۳۶، ۳۷)

"ایک دوست کو لکھتے ہیں : بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا، لاکھوں مر گئے جو زندہ ہیں، اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں۔" ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر... کرتے ہیں.... حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم فاتحین نے اپنے مغلوب حریف کے اہل و عیال و نسل کے ساتھ اس قسم کا سخت برتاؤ کیا ہوگا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں نے بہادر شاہ کے خاندان کے ساتھ رَوا رکھا۔ ان تمام خیالات کے ہجوم سے مرزا غالب اس قدر متأثر ہیں کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جاتا ہے۔ اپنے دردِ دل کا اظہار ذیل کے اشعار میں کس خوبی سے اور کیسے پُردرد الفاظ میں کرتے ہیں :

گُلشن میں بند وبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج[۳۵] "

(مُقدمہ : ۳۸)

---

۳۴ یہ شعر غالب کی اُس غزل کا ہے جو غالب نے بہادر شاہ ظفر سے خطاب و خلعت اور خدمت پانے پر طرز تازہ میں ۴ جولائی ۱۸۵۰ء یا اس کے معاً بعد لکھی؛ اسے واقعہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں دیکھنا درست نہیں۔

۳۵ پہلا شعر بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۱۰۶ - ۱۰۷، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۳۰) اور دوسرا شعر نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) ص ۹۲ کے حاشیے پر موٹے قلم سے (بقیہ اگلے صفحے پر دیکھیے)؛

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کے حبِّ وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے ملک کی بدنصیبی پر روتے ہیں۔ ایک .... جگہ فرماتے ہیں :

ہندوستان سایۂ گل، پایۂ تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بُتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ[۲۸]

(مقدمہ : ۳۰)

(گذشتہ صفحے سے پیوستہ) ... شکستہ خط میں تحریر ہوا ہے۔ گویا دونوں شعر ۱۸۵۷ء سے ۳۰-۳۵ سال پہلے کے ہیں اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غالب نے یہ شعر اہلِ ہند کی تباہی اور بہادر شاہ کے اہل و عیال پر انگریز حکام کے ظالمانہ سلوک سے متاثر ہو کر قطعاً نہیں لکھے — غالب کے ایک جدید شرح نگار نے بھی ان اشعار کی توجیہہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے پس منظر میں کی ہے اس کا بیان درج کر دینا لطف اور عبرت سے خالی نہ ہوگا :

" غالب کا یہ شعر غالباً ان ایام میں لکھا گیا جب کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء واقع ہوا، یا بعد میں گراشارہ انہیں حالات کی طرف ہے جو اس ہنگامے میں دہلی والوں پر گذرے۔ یہاں "گلشن" سے مراد دہلی سے ہے اور "قمری" دہلی والوں سے۔ اس وقت دہلی کی تمام آبادی بہ استثنائے چند، جن کی رعایت انگریزوں کو منظور تھی، سب دہلی سے نکال دی گئی تھی۔ گھر کی محبت کس کو نہیں ہوتی اور بالخصوص جب بے سر و سامانی کی حالت میں باہر پڑے ہوئے ہوں۔ باہر نکالے ہوئے لوگ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے شہر میں داخل ہوتے اور پہرہ داروں سے بچ کر اگر گھر پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو حکومت کا تالا لگا ہوا دیکھ کر مایوسی کی وجہ سے چوکھٹ پر سر ٹکا دیتے۔ اس زمانے میں گنڈا زنجیر عام طور پر نیچے چوکھٹ میں ہی لگائی جاتی تھی۔ ان حالات کا بیان غالب اس شعر میں کرتے ہیں۔ دوسرا شعر بھی اسی تاثر کے تحت لکھا گیا ہے۔"

(صاحبزادہ احسن علی خاں، مفہومِ غالب، مکتبۂ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۴)

۲۸ یہ اشعار بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) سے ماخوذ ہیں (نقوش، ص ۱۹۲-۱۹۳، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۴۳) یعنی ۱۹ برس کی عمر کے غالب کے اور انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۴۱ برس پہلے کے۔ اول الذکر شعر کی سند کے ساتھ دور آفریدی نے بھی لکھا ہے کہ " غدر میں ہندوستانیوں کی ناکامی (بقیہ اگلے صفحے پر دیکھیے)

"ایک خط میں لکھتے ہیں: خداوندا! کیا تم دلی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو؟ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟ .....
ان تمام واقعاتِ دلخراش پر روتے ہیں اور فرماتے ہیں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں[۲۹]

کس قدر معنی خیز اور دردناک شعر ہے۔"

(مقدمہ: ۳۹)

"اگر مرزا غالب کے دیوان کو بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے۔ اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمتے۔ فرماتے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں[۳۰]

(مقدمہ: ۳۹، ۴۰)

(گذشتہ صفحے سے پیوستہ) ... اور انگریزوں کی کامیابی کے بعد دلی پر جو کچھ گذری اس پر غالب کا دل رو پڑا۔"
[دورآفریدی، ادبی اقدار، اردو ریسرچ اکاڈمی، لاہور، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۶]

۲۹، ۳۰ یہ اشعار غالب کی اس غزل سے ہیں جو دہلی اردو اخبار جلد ۱۳، نمبر ۳۴ مورخہ ۲۱ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں اس قید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ یہ اس ہفتے کا کلام ہے (نسخۂ عرشی، ص ۲۴۷) ظاہر ہے یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب دلی آباد، قلعہ معمور، سلطنت بدستور اور ملکی آبادی موجود تھی۔

"اس وقت ملک کی جو حالت تھی، اُسے یاد کر کے کہتے ہیں :

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے[۳۵]"

(مقدمہ : ۴۰)

"اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ضبط نہیں ہوتا اور بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں :

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں[۳۶]"

(مقدمہ : ۴۰)

"جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے، اُس وقت سے برابر، اُن کا یہی دعویٰ رہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کے مفاد کی غرض سے حکومت کر رہے ہیں، اور یہ کہا گیا کہ ملک ہندوستان کی حکومت، ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آئے گا جب حکومت کی ساری ذمہ داری اہلِ ہند کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں :

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

---

۳۵ یہ شعر، ۱۸۵۷ء سے چالیس سال سے بھی پہلے کا ہے اور بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے، (نقوش، ۲۶۶، ۲۹۷، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۱۱۰)

۳۶ یہ شعر ملکی آزادی کے جانے سے کئی برس پہلے (اگست ۱۸۵۲ء) کا ہے!

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک [۳۳]"

(مقدمہ : ۴۱)

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے ملک و دولت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اُن کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فن و کمال، یہاں تک کہ اُن کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے باکمال شاعر اور صاحبِ دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایہ میں انھوں نے اس کا مرثیہ لکھا وہ حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رُلواتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر دل نہیں مانتا:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغباں و کفِ گُل فروش ہے

---

[۳۳] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ ۱۸۲۱ء میں شامل ہیں (نسخۂ حمیدیہ ص ۱۲۰) اور کوئی متعین سیاسی پس منظر نہیں رکھتے۔

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے[۲۳]"

(مقدمہ : ۳۷، ۳۸)

حقیقت یہ ہے کہ اشعارِ غالب کا واقعاتِ ستاون پر انطباق اور اشعارِ غالب کے لیے سنہ ستاون کے چوکھٹے یا پس منظر کی فراہمی، تاریخی غلطی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سیاق و سباق میں کلامِ غالب کی توجیہہ، دراصل نتیجہ ہے غالب کے کلام کی زمانی ترتیب سے صرفِ نظر کا ۔ اور یہ خرابی یا خصوصیت ڈاکٹر سید محمود ہی سے خاص نہیں، جب اور جہاں غالب کے مفسّروں نے اس کا لحاظ نہیں رکھا، استنباطِ نتائج میں ٹھوکر کھائی ہے ـــــ اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے :

"غالب ابھی مکتب ہی میں تھا کہ اس نے شاعری شروع کر دی، لیکن اس کا کمال ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوتا ہے[۲۴]۔" ـــــ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"مغلیہ سلطنت کے جانے سے جو صدمہ غالب کو ہوا، اس کا اثر غالب کے کلام میں درد و سوز سے پایا جاتا ہے[۲۵]۔" ـــــ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

---

۲۳ غالب کی یہ غزل ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے اکتیس برس پہلے کی زائیدۂ فکر ہے۔ یہ نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۶۱۔ ل پر مندرج ہے۔ اس غزل کو ۱۸۵۷ء کے حوالے سے "دل ہلا دینے اور خون کے آنسو رُلوا دینے والا دردناک مرثیہ" قرار دینا، تاریخی اعتبار سے صریح غلطی ہے۔ دور آفریدی نے بھی اس قطعہ بند غزل کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ "مابعد غدر" غالب کی حد درجہ حسرت سامانیوں پر مظہر ہے جو درست نہیں ـــــ [ادبی اقدار، اُردو ریسرچ اکاڈمی، رامپور، ۱۹۷۳ء، ص ۶۰]

۲۴، ۲۵ (الف) ہم قلم، کراچی، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۹۲

(ب) اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۶ء، جلد ۲، ص ۳۴

یہ کہنا صحیح نہیں کہ غالب کا شعری کمال ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوا، اس فتنہ و فساد کے بعد تو خود غالب کے بقول :

"شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔" [بنام: سرور، ۱۸۵۹ء]

"بعد غدر، ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ . . . . دو تین غزلیں فارسی، ہندی لکھی ہیں۔"

[بنام: کلب علی خاں، ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء]

اور انقلاب ستاون کے بعد کی یہ چند چیزیں غالب کے کمال شعری پر دال نہیں۔ اسی طرح مغلیہ سلطنت کے جانے کے کسی صدمے کا انعکاس یا اثر بھی درد یا سوز کے ساتھ کلام غالب میں نہیں ملتا۔

○

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، چودھری محمد حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب کے :

"سارے کلام میں صرف ایک شعر ہندی اسلام کے دورِ تنزل کی عکاسی کرتا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے متعلق ہے : اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے۔"

[مے لالہ فام، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۰۱]

یہ شعر، بہادر شاہ ظفر کے متعلق نہیں، انقلاب ستاون سے تیس اکتیس برس پہلے، یہاں تک کہ ظفر کی تخت نشینی سے بھی دس گیارہ سال قبل کا ہے، دیکھیے: نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء)، ورق ۹۱، ۱

○

"غالب کے عہد میں ہم پر جو وقت پڑا تھا، اُس کا شعور اور اُس کی ترجمانی غزلیات (غالب) میں عمومیت اور آفاقیت کے انداز میں ہے . . . . جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب انگریزوں کی وحشت و بربریت کی یلغار زوروں پر ہے، ہر طرف کشت و خون اور شکست و ریخت کا ہنگامہ گرم ہے، غالب گہرے دُکھ کے ساتھ سوچ رہے ہیں :

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب	اِس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو	آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

[فتح محمد ملک، صحیفہ، لاہور اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص۱۰]

سن۔ اور تائید میں غزلیاتِ غالب سے جو دو شعر پیش کیے گئے ہیں، اُن میں سے پہلا نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) سے ہے یعنی جنگِ آزادی سے چھتیس برس پہلے کا اور دوسرا نسخۂ رامپور جدید (۱۸۵۵ء) میں موجود ہے، اِن اشعار کو جنگِ آزادی میں ناکامی انگریزوں کی وحشت و بربریت کی پُرزور یلغار اور ہمہ جہتی کشت و خون اور شکست و ریخت کے ہنگامۂ گرم پر غالب کے گہرے دُکھ اور فکر سے تعبیر کرنا درست نہیں۔

○

غالب کے شعری رویّے پر انقلاب ستاون کے اثرات کا کچھ اندازہ، خطوطِ غالب کے حوالے سے ممکن ہے۔ اشراف و اعیان ہی انقلاب کا شکار نہیں ہوئے، یہ سیلابِ بلا ہمارے بیش قیمت علمی اور تہذیبی سرمائے کو بھی بہا لے گیا، قلمی نسخے مٹ گئے، کتب بیں لُٹ گئیں:

"انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو۔ اس کا پتہ کیونکر لگے؟ لُوٹ کا مال چوری چوری کوٹنے کُمتروں میں بِک گیا اور اگر سڑک پر بھی بِکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو۔"
[بنام: ثاقب، ۸۰ فروری ۱۸۵۸ء]

"آپ مرزا صابر (قادر بخش) کا تذکرہ (گلستانِ سخن) مانگتے ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔"[۳۵]
[بنام: حبیب اللہ ذکاؔ، ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء]

---

[۳۵] مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ "گلستانِ سخن" ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع مرتضوی، دہلی سے پہلی بار شائع ہوا۔ طبع اوّل کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو، کراچی کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے اور ایک مجلس ترقیِ ادب، لاہور کے کتاب خانے کی زینت ہے۔

"خداوند! کیا تم دلّی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو جو حضرت شیخ (کلیم اللہ جہاں آبادی) کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو؟ "این دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد" بادشاہ (ظفر) کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور (بہادر شاہ ظفر کے مرشد) کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمت اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکے گا۔"

[بنام: احمد حسن مودودی، یکم ستمبر ۱۸۶۳ء]

خود غالب کے سرمایۂ علمی کا ایک بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد میں غارت ہوا۔ اس آفت کا ذکر انھوں نے اپنے خطوں میں اکثر بڑے درد اور حزن و رقت کے ساتھ کیا ہے:

"حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لُٹ گیا۔"

[بنام: نواب کلب علی خاں، ۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء]

"غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لُٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟"

[بنام: یوسف علی خاں عزیز، نومبر ۱۸۵۹ء]

"میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن کے لاکھوں کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے، اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔"

[بنام: چودھری عبدالغفور سرور، جولائی ۱۸۵۹ء]

"میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا فارسی، کیا اُردو، کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی، وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے۔ سو اُن دوستوں کا زمانۂ غدر میں گھر ہی لٹ گیا، نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر میں اپنا کلام نظم و نثر کہاں سے لاؤں؟"

[بنام: تمنا مرزا پوری، ۱۲ جولائی ۱۸۶۴ء]

"میرا ایک بھتیجا بھائی ہے، نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میرے نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا...... سب نسخے اُس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتاب خانہ، ڈر کر عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا۔"

[بنام: صاحب عالم، جولائی ۱۸۶۱ء]

"کیا کہوں تم سے، ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو، میرے بھتیجے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیاتِ نظم فارسی" چوتن پچپن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیمروز" اور "دیوانِ ریختہ" سب مل کر سو سوا سو جزو مُطلّا اور مذہّب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادے

نے اس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی ۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا ۔ کہاں سے
یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لُٹے ۔ وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ ، خوانِ یغما ہو گیا
ہر چند میں نے آدمی دوڑائے ، کہیں سے ، ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی ۔
وہ سب قلمی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے ، تو
اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا ۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا "

[بنام : آرام ، ۱۱ ۔ دسمبر ۱۸۵۸ء]

" یہ شہر بہت غارت زدہ ہے ۔ نہ اشخاص باقی ، نہ امکنہ ۔ کتاب فروشوں
سے کہہ دوں گا ، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں سے کوئی رسالہ آجائے گا
تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا ۔ "

[بنام : جنوں ، ۲۲ ۔ فروری ۱۸۶۱ء]

یہی نہیں کہ غالب کا سرمایۂ علمی ، کیا نظم ، کیا نثر ، کیا اردو ، کیا فارسی ۱۸۵۷ء کے
فتنہ و فساد کی نذر ہوا ۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ستم یہ کہ اس غارت گری کے نتیجے میں غالب
کا ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا ، سخن سنجی اور جو ہر فکر کی درخشندگی جاتی رہی ۔ قوتِ
ناطقہ پر تصرف باقی نہ رہا اور وہ شعر سے بیزار ہو گئے :

" بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم ، فارسی اور اردو سراسر دیکھا ہوا
میرا ، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا ، غدر میں لٹ گیا ۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر
باطل اور دل افسردہ ۔ ۔ ۔ ۔ دو تین غزلیں ، فارسی ، ہندی ۔ ۔ ۔ ۔ لکھی ہیں ۔ "

[بنام ، نواب کلب علی خاں ، ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء]

" شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز کوئی نسبت باقی نہیں رہی ۔ اس فتنہ و
فساد (۱۸۵۷ء) کے بعد ایک قصیدہ جو " دستنبو " (نومبر ۱۸۵۸ء) میں ہے اور
ایک قصیدہ (مارچ ، اپریل ۱۸۵۹ء) گورنر بہادر غرب و شمال (جارج ایڈمنسٹن)

کی مدح میں ایک اور قصیدہ (مارچ ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب (سر رابرٹ منٹگمری) کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی اس نظم کے سوا، اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجئے۔"

[چودھری عبدالغفور سرور' ۱۸۵۹ء]

" فارسی کیا لکھوں، یہاں ترک تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کر تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بر کاب ہوں۔"

[بنام: جنوں بریلوی' ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء]

" میں اموات میں ہوں، مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا، معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ .... گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے .... خلعت (وغیرہ) .... مجھ کو ملا کرتا ہے، اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں، دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعت شعر، اعضاء و جوارح کا کام نہیں دل چاہیئے، دماغ چاہیئے، ذوق چاہیئے، اُمنگ چاہیئے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایت فن' اس کے اسباب کہاں؟ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ۰

[چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۹ء]

" اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف، بھٹی متروک۔ نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین

نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کی سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں
اکثر اطراف وجوانب سے شعر آجاتے ہیں۔ اصلاح پا جاتے ہیں۔ باور کرنا
اور مطابق واقعہ سمجھنا۔" [بنام: علائی۔ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء]

"میں شاعر سخن سنج، اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان
کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ
گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا؟"

[بنام: تفتہ، ۱۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء]

"نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو، وہی دو چار
ورق ("دستنبو") اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں۔۔۔۔ جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا
پاؤ گے تو دیکھ لو گے۔" [بنام: مجروح، ہفتم نومبر ۱۸۵۸ء]

"نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہر فن کی
رخشندگی کہاں؟ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دلوا سکتا۔"

[بنام: سید احمد حسن۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۰ء]

"قصیدے کا قصد۔۔۔۔ تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک
ملکے کے کہ وہ پچاس برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو
سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران
رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے؟"

[بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء]

"ازدیرباز بہ نظم و نثر نمی گرایم۔ نظم خواہی پارسی، خواہی اردو،

خوابیست فراموش ۔"

[بنام: رفعت بھوپالی، انشائے نورچشم، ۱۴۔ اپریل ۱۸۶۱ء،

بحوالہ: مقدمہ دیوان غالب، عرشی ص ۹۵]

"میاں! تمہاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریق قصیدہ تمہاری خاطر سے لکھ کر بھیج بھے (ایلن براؤن کے بیٹے کی ولادت کا اکیس شعری 'قصیدۂ اردو' جسے آرام نے غالب سے لکھوا کر ایلن براؤن کو پیش کیا) سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہوگا تو گنہ گار، بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے۔"

[بنام: شیونرائن آرام، ۲۲۔ اپریل ۱۸۵۹ء]

"گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بداست مرگ، ولے بدتراز گمانِ تو نیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثر فارسی کی فرمائشیں کرتے ہو، غنیمت نہیں جانتے کہ وہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے؟"

[بنام: غلام نجف خاں (؟) ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء

خطوطِ غالب: مولانا غلام رسول مہر، جلد ۲، ص ۴۴۲]

"میرا حال اس فن (شعر و سخن) میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے شعر سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے، سو گاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب ÷ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں :

اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے ؟"

[بنام : چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۸ء]

" میاں ! کیا باتیں کرتے ہو ؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا ؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں ..... کتابیں کیا چھپواؤں گا ۔ "

[بنام : مجروح ۰ اکتوبر ۱۸۵۸ء]

" اگر مجھے قوتِ ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو .... حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا ۔"

[بنام : جنوں بریلوی ۴ جنوری ۱۸۶۲ء]

" اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں ؟ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں ۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں ۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت ۔ یہ جو لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے ۔"

[بنام : جنوں بریلوی، ۱۹ جون ۱۸۶۳ء]

" اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار ۔ ! "

[بنام : تفتہ ۰ ۱۸۶۳ء]

" ادھر قصیدے کی فکر، اُدھر روپے کی تدبیر، حواس ٹھکانے نہیں ۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان ۔ "

[بنام : تفتہ ، ۴ ۔ مارچ ۱۸۶۳ء]

" سبحان اللہ ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر

ہوں' جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو!"

[بنام: تفتہ، جولائی ۱۸۶۳ء]

"بے بے تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالبؔ شعر کہتا ہے! یا کہہ سکتا ہے؟

[بنام: نیّر کاکوروی، ۱۰، جنوری ۱۸۶۴ء]

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ:

"ساٹھ برس کی زندگی میں غالب کے ذہن اور زندگی پر یہ آخری اور سب سے بڑی ضرب تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے' ان کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم اردو میں زیادہ۔"

[غالب شناسی، بمبئی ۱۹۶۵ء، ص ۸۱]

انقلاب ستاون نے غالب سے ولولۂ شعری چھین لیا' ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے درمیان غالب نے گنتی کے شعر کہے، سخن سنجی جاتی رہی اور صرف سخن فہمی رہ گئی تھی، اسی لیے شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ:

"غدر اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے..... دو تین اُردو غزلیں اور چند فارسی قصائد.... ان سے ایک علاحدہ دورِ شاعری' ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں۔ حقیقتاً یہ زمانہ مرزا غالب کی اُردو نثر کا تھا۔"

[غالب نامہ، طبع اوّل' ۱۹۳۶ء، ص ۱۷۱]

غالب نے اسی زمانے میں یہ جو لکھا ہے کہ: "اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار" یہ بے مبالغہ اور بیان واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرام کی اشعار شماری کے مطابق: "چوتھے دور (۱۸۵۶ء — ۱۸۶۹ء) میں جس میں شاعر کا چودہ برس کا کلام درج ہے ایک قطعہ اور ایک غزل' فقط دو نظمیں اردو میں لکھی ہیں۔"

[غالب نامہ، طبع اوّل ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۳]

اکرام صاحب کے یہ اعداد و شمار قریب چالیس برس پہلے کے ہیں۔ اس دوران میں نئے ماٰخذ سے غالبیات میں اضافہ ہوا ہے۔ غالب کے خطوط یا دیگر ذرائع کی بنیاد پر اب ہم غالب کے جن اشعار کو ہنگامۂ ستاون کے بعد سے آخر عمر ۱۸۶۹ء تک کے درمیان کا قرار دے سکتے ہیں، اُس کی تفصیل یہ ہے: سات غزلیں، گیارہ قطعات، چار قصائد، تین رُباعیات، ایک مرثیے کے تین بند، تین شعر مثنوی کی صنف سے اور کچھ مفرد اشعار! یہ ہے انقلاب اور اس کے بعد سے انتقال تک کے بارہ برسوں کا کل شعری اکتساب، اس کا بھی زیادہ حصہ غالب کے لفظوں میں "بلند رتبہ نہیں"۔ ان میں سے بیشتر چیزیں فرمائشی، ہنگامی اور وقتی نوعیت اور اہمیت کی ہیں ــــ انقلاب ستاون کی غارت گری کے اس المیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا:

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

[بنام: مہر ۱۸۵۸ء]

اس کے برعکس نثر نگار غالب کا ظہور انقلاب ستاون کے بعد ہوا:

"حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۵۷ء - ۱۸۶۹ء) مرزا غالب کی اُردو نثر کا تھا۔"[۳۸]

ــــ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

"اس زمانے (۱۸۵۷ء) میں اور اس کے بعد جب تک وہ (مرزا غالب) زندہ رہے اُن کی توجہ نثر پر رہی، فارسی میں کم اور اُردو میں زیادہ۔"[۳۹]

ــــ ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کی معروف اور ضخیم فارسی نثری کتب "پنج آہنگ" (۱۸۴۹ء) اور "مہر نیمروز" (۱۸۵۴ء) انقلاب سے پہلے کی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فارسی نثر میں غالب کی صرف دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں

---

۳۸ غالب نامہ، طبع اوّل، ۱۹۳۶ء، ص۱۱   ۳۹ غالب شناسی، طبع اوّل ۱۹۶۵ء، ص۲

ایک "دستنبو" (۱۸۵۸ء) اور دوسری "قاطع بُرہان" (۱۸۶۲ء) جس کی دوسری اشاعت معمولی ردّ و بدل اور کچھ مزید فوائد و مطالب کے ساتھ "درفشِ کاویانی" کے اضافی نام کے ساتھ ۱۸۶۵ء میں سامنے آئی۔ "دستنبو" براہِ راست انقلاب ستاون سے متعلق ہے جبکہ "قاطع بُرہان" کو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے بقول: "دستنبو کا ثمرِ معنوی سمجھنا چاہیے"[۱۳]۔

اُردو نثر میں غالب کی کوئی کتاب سرے سے ماقبل انقلاب شائع نہیں ہوئی۔ اُن کی نثر اردو کی سب کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد چھپیں۔ مباحثہ بُرہان کے سلسلے کی چار کتابیں: لطائفِ غیبی (۱۸۶۴ء)، نامۂ غالب (۱۸۶۵ء)، سوالاتِ عبدالکریم (۱۸۶۵ء) اور تیغِ تیز (۱۸۶۸ء) تو لکھی ہی گئیں ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ایک سلسلے سے ایامِ انقلاب میں غالب کی خانہ نشینی کا حاصل ہیں۔

خطوطِ غالب کے سارے مجموعے بھی انقلاب کے بعد منظرِ عام پر آئے، دو اُن کی زندگی میں: "عودِ ہندی" (۱۸۶۸ء)، "اُردوئے معلّٰی" (۱۸۶۹ء) اور متعدد اُن کی زندگی کے بعد: "مکاتیبِ غالب" (۱۹۳۷ء)، "نادراتِ غالب" (۱۹۴۹ء)، "غالب کی نادر تحریریں" (۱۹۶۱ء) وغیرہ — ان خطوط کا اسی فیصد سے متجاوز حصہ انقلاب ستاون کے بعد کا ہے۔

اس عقب میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اس انقلاب کے بعد ہوا، اور اُن کا کل سرمایۂ نثرِ اُردو کسی نہ کسی سطح پر اس انقلاب ہی کی دین اور عطا ہے۔

○

---

[۱۳] غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم بمبئی، ص ۱۶۷

دید و دریافت

۱۹۶۹ء میں غالبؔ صدی نے غالبیات کے ساتھ ساتھ تحقیق کا مذاق عام کر دیا۔ بھوپال میں غالبؔ کے خود نوشت اوّلین دیوان اور لاہور میں "گلِ رعنا" کے خود نوشت مخطوطے کی دریافت گلِ سر سبد ہے۔

—— ڈاکٹر گیان چند

"گُلِ رعنا" بخطِّ غالب

ایک نادر مخطوطہ ، مکتوبہ ۱۸۲۸ء

"گُلِ رعنا" غالب کے اردو اور فارسی کلام کا پہلا انتخاب ہے جسے غالب نے اپنے کلکتہ کے دورانِ قیام[1] میں اپنے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد[2] کی فرمائش پر جو اس زمانے میں کلکتے میں مقیم تھے ، مرتّب کیا ۔ "گُلِ رعنا" کے دیباچے میں غالب لکھتے ہیں :

باسراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگِ غزل خوانی مرا

ہرچند صیدِ زبونِ دامگاہِ حیرانیم و دژم فرورفتۂ نشیب لاخِ نادانی سیم در نوردِ دایرہ ہر حرف سراز حلقۂ دامے برمے آرد ، و کلکم از عجزِ تحریر

---

[1] دیکھیے ایک قیمتی مضمون : غالب کا کلکتہ : پروفیسر حمید احمد خاں ، ماہِ نو ، کراچی ، فروری ۱۹۵۰ء ، صفحہ ۲۴ - ۲۷

[2] مولوی سراج الدین احمد کے حالات کے لیے رجوع کیجیے :

(الف) آثارِ غالب ، قاضی عبدالودود ، صفحہ ۵۷ و بہ بعد ، در علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر ۴۹ - ۱۹۴۸ء

ب) بزمِ غالب ، عبدالرؤف عروج ، ادارۂ یادگارِ غالب ، کراچی ، ۱۹۶۹ء ، صفحہ ۱۹۱-۱۹۲

در کسوتِ ہر نقطہ پشت بستہ بہ زمین میگزارد ، اما خونِ گرمیِ انداز مہربانیش را نازم کہ آتشِ افسردۂ مرا شعلہ در ساخت و خاکِ زمین گیر مرا علم رعنائیِ غبار ارزانی داشت فرمان دادہ است کہ منتخبے از دیوانِ ریختہ و غزلے چند از پارسی در یک سفینہ باہم در آمیزم وایں پردۂ دو رنگ بہ پیشِ طاق بینشِ نظارگیانِ یک رنگ آویزم۔ از وے بہ زبان گفتنی وازمن بجان پذرفتنی ۔ “

کلکتے کا سفرِ دور و دراز غالب نے خوشی سے اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں بے حد پریشان خاطر اور مضطرب تھے اور مطالبِ دشوار در پیش تھے۔ ایسے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش کو ” بجان “ پورا کرنا ، باہم گہرے مخلصانہ روابط پر دلالت کرتا ہے ۔

مولوی سراج الدین احمد سے وقتی مودت کا تعلق نہیں تھا۔ یہ رشتۂ مؤانست غالب کو عمر بھر عزیز رہا۔ اخیر عمر کے ایک خط موسومہ غلام غوث بیخبر میں بھی غالب نے مولوی سراج الدین احمد کے اخلاص کو حاصلِ حیات ٹھہراتے ہوئے ، اُن کے حُسنِ سیرت کو حسرت سے یاد کیا ہے :

” ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خواص میں سے ، عوام کا شمار نہیں ۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے ۔ ایک ، مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ ، دوسرا منشی غلام غوث سلمہٗ اللہ تعالیٰ ، لیکن وہ مرحوم حُسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اُس کا خاص میرے ساتھ تھا[۲] “

بہر نوع کلامِ غالب کا یہ مجموعہ موسوم بہ ” گلِ رعنا “ ترتیب پانے کے سوا سو سال سے

---

[۲] اردوئے معلّی ، طبع اوّل : اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۹ء ، صفحہ ۲۰۸

بھی زیادہ گوشۂ گمنامی میں رہا اور منصّۂ شہود پر نہ آسکا۔ اس مجموعے کے آغاز اور خاتمے کی فارسی نثری تحریریں اگر پنج آہنگ[۴] (۱۸۴۹ء) اور پھر کلیاتِ نثرِ غالب[۵] (۱۸۶۸ء) میں شامل نہ ہو جاتیں تو اہلِ علم شاید اس مجموعے سے یکسر بے خبر ہی رہتے۔ ۱۸۹۷ء میں حالی نے اپنی کتاب "یادگارِ غالب" میں "دیوانِ ریختہ" کے تحت گفتگو کا آغاز "گلِ رعنا" سے کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا حسرت موہانی نے غالب کا اُردو دیوان اپنی شرح کے ساتھ شائع کیا تو اس کے ضمیمے کے طور پر "گلِ رعنا" سے کچھ ایسے اشعار درج کیے جو مطبوعہ اُردو دیوان میں موجود نہیں تھے۔ حسرت موہانی کے لفظ یہ ہیں، مرزا غالب نے:

"اپنے دیوان اُردو فارسی کا خود انتخاب کرکے اس کا نام "گلِ رعنا" رکھا تھا۔ راقم کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ چنانچہ یہ اشعار ضمیمہ اسی سے نقل کیے گئے ہیں[۶]۔"

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معروف کتاب "غالب" میں کیاب تصانیف کے تحت "گلِ رعنا" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ اس کا صرف ایک حصّہ ان کے پاس ہے[۷]۔"

۴۔ پنج آہنگ، طبع اوّل، مطبع سلطانی، قلعہ دہلی ۱۳۔ رمضان ۱۲۶۵ھ/ ۲۔ اگست ۱۸۴۹ء

۵۔ کلیاتِ نثرِ غالب فارسی، طبع اوّل: مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء

۶۔ ضمیمہ دیوانِ غالب مع شرح، حسرت موہانی، ۱۹۰۰ء، صفحہ ۱۹۱

۷۔ غالب، طبع چہارم، عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۸۳

غالب، طبع سوم، ۱۹۴۴ء (ص ۳۳۳) اور طبع دوم ۱۹۴۱ء (ص ۳۰۹) میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا تھا کہ:

"میں جس حد تک معلوم کرسکا ہوں یہ مجموعہ (گلِ رعنا) کبھی شائع نہیں ہوا، سُنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ مولانا حسرت موہانی کے پاس ہے۔"

غالب، طبع اوّل، ۱۹۳۶ء (ص ۲۹۳) میں مولانا غلام رسول مہر نے یہ لکھا تھا کہ:

"میں جس حد تک معلوم کرسکا ہوں یہ مجموعہ (گلِ رعنا) کبھی شائع نہیں ہوا، اور نہ اس کا کہیں سے پتہ مل سکا ہے۔"

مالک رام[۸] اور مولانا امتیاز علی عرشی[۹] نے بھی ایک موقع پر نسخۂ حسرت کو ناقص بتایا ہے لیکن یہ ناتمام، ناقص حصّہ بھی مولانا حسرت موہانی کی وفات (۱۹۵۱ء) کے بعد، یہ تک نہیں معلوم کہ کہاں گیا اور یہ کہ اب موجود بھی ہے یا تلف ہو چکا ہے۔ اغلب ہے کہ اُن کے کتب خانے کے ساتھ ضائع ہو گیا[۱۰]۔ اس طرح غالب دوست ایک بار پھر اس کتاب اور اس کے مندرجات سے محروم ہو گئے۔

حسنِ اتفاق سے ۱۹۵۷ء میں مالک رام کو "گلِ رعنا" کا ایک مکمل قلمی نسخہ دستیاب ہوا، جس کے حصّۂ فارسی کے بارے میں ایک تعارفی مضمون ۱۹۶۰ء کے وسط میں شائع ہوا[۱۱]۔ اس کے کوئی آٹھ برس بعد گلِ رعنا" کے حصّۂ اُردو کے تعارف میں مالک رام

---

۸ مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۳

۹ (الف) امتیاز علی عرشی، دیباچہ، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، ص ۲

(ب) امتیاز علی عرشی، دیباچہ، انتخابِ غالب، ۱۹۴۲ء، صفحہ ک

۱۰ حسرت موہانی کے قیمتی ذخیرۂ کتب کا ذکر کرتے ہوئے بابائے اُردو نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"حسرت موہانی کی وفات ہر اعتبار سے صدمۂ عظیم ہے لیکن ایک بات کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے۔ ان کے کتب خانے میں اردو کا بہت اچھا اور بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بہت سے مخطوطات، پرانے تذکرے، قدیم اساتذہ کا کلام، پرانے اخبار اور رسالے اور بہت سی ایسی مطبوعات ہیں جو اب نایاب ہیں اور جو انھوں نے بڑی احتیاط اور محنت سے جمع کی تھیں۔ میں نے بارہا اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اس ذخیرے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیجیے کہ تلف ہونے سے بچ جائے...... اب اُن کے انتقال کے بعد نہ معلوم اس کا کیا حشر ہو گا۔ ہماری بے شمار عزیز چیزیں، خاص کتب خانے تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اُن کو تلف ہونے سے بچانا ہمارا بہت بڑا فرض ہے۔"

[چند ہم عصر مطبوعہ ۱۹۵۱ء، ص ۲۶۳]

۱۱ مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۳، یہ مضمون افکار، کراچی، غالب نمبر فروری مارچ ۱۹۶۹ء میں بھی انتخاب ہوا (ص ۱۴۹-۱۶۸)

کا قیمتی مضمون چھپا۔[۱۳] اس سے پہلے مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب اردو (۱۹۵۸ء) میں مالک رام کے اس مخطوطے سے استفادہ کیا اور اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

"گلِ رعنا" کہ اس مخطوطے میں سالِ انتخاب ناقص رہ گیا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ قیامِ کلکتہ کا کارنامہ ہے جو ۴۔ شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹۔ فروری ۱۸۲۸ء) سے شروع ہو کر ربیع الاوّل ۱۲۴۵ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں ختم ہو گیا تھا۔"

خوبیٔ قسمت ۱۹۶۹ء میں عین اُن دنوں جب غالب کے صد سالہ جشن کا زور شور تھا، راقم الحروف کو "گلِ رعنا" کے ایک اہم تر اور نادر و نایاب مخطوطے کا سُراغ ملا۔ یہ سارے کا سارا غالب کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ فروری ۱۹۶۹ء میں اس مخطوطے کا تعارف راقم الحروف نے اپنی کتاب "اشاریۂ غالب" میں شامل کیا اور اس مخطوطے کے چار عکس بھی شائع کیے۔ اس کے بعد یہ تعارفی سطور اور تصاویر "نقوش" کے غالب نمبر حصّہ دوم میں شائع ہوئیں[۱۵]۔ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے جو چار عکس راقم نے شائع کیے، اُس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ "گلِ رعنا" کے دیباچے کا آخری صفحہ جس پر غالب نے تاریخِ انتخاب درج کی ہے۔

۲۔ "گلِ رعنا" کے انتخاب کلامِ اُردو کا آخری صفحہ۔

۳۔ "گلِ رعنا" کے انتخاب فارسی کی گیارھویں غزل کے آٹھ شعر۔

۴۔ "گلِ رعنا" خطّی نسخۂ غالب کے آخری صفحے کا عکس۔

۱۳۔ نذیر ذاکر، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۹۶-۳۲۰ مقالہ: "گلِ رعنا — غالب کا گمشدہ انتخاب"

۱۴۔ دیباچہ، دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۱ نیز ص ۸۱-۸۲

۱۵۔ اشاریۂ غالب، ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور، فروری ۱۹۶۹ء ص ۳۹۹-۴۰۸

۱۶۔ نسخۂ گلِ رعنا (بخطِ غالب)، سیّد معین الرحمٰن، نقوش، لاہور۔ غالب نمبر، حصہ دوم اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۳۲۷-۳۳۳

"گُلِ رعنا" کا یہ پورا مخطوطہ بخطِ غالب ہے [۵۸] اور اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

میں نے اس مخطوطے کی دریافت کی اطلاع منجملہ اور غالب دوستوں کے اکبر علی خاں عرشی زادہ (رامپور) کو دی تو انھوں نے اس مخطوطے کی مائیکروفلم بھیجنے کی فرمائش کی۔ میں انھیں صرف محولہ بالا چار عکس ہی بھیج سکا۔ عرشی زادہ کا بیان ہے کہ انھوں نے :

"اس دریافت کی اطلاع "ہماری زبان" علی گڑھ میں اشاعت کے لیے بھیج دی جو شمارہ ۱۵۔ اگست ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔" [۵۹]

"ہماری زبان" کا یہ شمارہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ عرشی زادہ کی ایک نگارش "مخطوطہ گُلِ رعنا بخطِ غالب : غالبیات میں ایک اور بیش بہا دریافت" کے عنوان سے "ہماری زبان" علی گڑھ شمارہ یکم ستمبر ۱۹۷۰ء (صفحہ ۳ تا ۶) میں شائع ہوئی۔ [۶۰] اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "گُلِ رعنا" کے نسخوں میں سے وہ :

"نسخہ بھی جو اب تک کے معلوم نسخوں میں سب سے زیادہ اہم، زیادہ قابلِ قدر اور زیادہ لائقِ اعتبار ہے دریافت ہو گیا ہے۔ اس اطلاع کے لیے میں اپنے کرم فرما دوست جناب سید معین الرحمٰن کا شکر گزار ہوں۔ موصوف نے یہ بھی کرم فرمایا کہ مجھے از رُوئے لطف نودریافت مخطوطہ

---

۵۸ گُلِ رعنا۔ بخطِ غالب کے علاوہ اسی زمانے میں راقم الحروف نے اس کے ایک نسبتاً کم اہم لیکن مخفی قلمی نسخے کی بھی پہلی بار نشاندہی کی :

"گُلِ رعنا" کا ایک خطی نسخہ لاہور میں حکیم محمد نبی جمال سویدا صاحب نبیرۂ حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس محفوظ ہے۔"

[اشاریۂ غالب، سید معین الرحمٰن، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۶]

"حکیم محمد نبی سویدا صاحب (لاہور) کے محزونہ نسخۂ گُلِ رعنا کے مخطوطے کا کاتب مجہول الاسم ہے لیکن اس کی کتابت بہر طور معاصر ہے۔" [اشاریۂ غالب، ص ۳۹۹]

۵۹ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء، ص ۳

۶۰ یہ "گُلِ رعنا" کی دریافت کے سلسلے کی ایک اطلاعی تحریر ہے، کوئی مفصل تعارفی مضمون نہیں۔

"گُلِ رعنا" کے عکس ارسال کیے [۱۹]۔ اِن عکسوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نودریافت "گُلِ رعنا" وہی اصل نسخہ ہے جو پہلے پہل غالب نے اپنے قلم سے نقل کیا تھا۔ غالب کی تصانیف کے معلوم مخطوطوں میں ۱۲۳۱ھ کے مکتوبہ دیوانِ اُردو کے بعد یہ دوسرا مخطوطہ ہے جسے تمام و کمال بخطِ غالب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اب فارسی و اُردو کے تقریباً نوسو اشعار اور چند فارسی نثروں کی تصحیح ہو سکے گی اور بعض اہم اختلافات کا ذکر ہوگا۔" [۲۰]

غالبیات میں "گلِ رعنا" کی بڑی اہمیت ہے۔ نودریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب کے بعد یہ واحد مجموعہ ہے جو پورے کا پورا غالب کا خود نوشتہ ہے۔ اس سے غالب کے اندازِ نگارش اور روشِ املا کے ضمن میں بہت سی باتیں نظر کے سامنے آتی ہیں اور اس کی بنیاد پر غالب کی روشِ تحریر اور املا کے بارے میں بعض نتیجے استنباط کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں کہ :

"گزشتہ سال (۱۹۶۹ء) میں لاہور میں "گُلِ رعنا" کا ..... ایک ایسا نسخہ ملا تھا، جس کو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تسلیم کیا گیا ہے ..... اس مخطوطے کو صرف خط کی پہچان کی بنا پر غالب کا لکھا ہوا مانا گیا ہے۔ سیّد معین الرحمٰن کے تعارف کے ساتھ اس کے چار صفحوں کے جو عکس "نقوش" غالب نمبر حصّہ دوم میں شائع ہوئے ہیں، اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خط اور اندازِ کتابت بالکل غالب کے نودریافت نسخے ... کے

---

[۱۹] اس بیان سے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ راقم الحروف نے گویا نودریافت مخطوطۂ گلِ رعنا بخطِ غالب کے سب عکس عرشی زادہ کو ارسال کر دیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مخطوطے کے صرف چار مذکورہ صفحات کے عکس عرشی زادہ کو بھیجے گئے ہیں، نہ یہ کہ مخطوطے کے کُل عکس ...

[۲۰] ہماری زبان، علی گڑھ، یکم ستمبر، ۱۹۷۰ء، ص ۵

مطابق ہے ۔" [ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵- نومبر ۱۹۷۰ء [اللہ]]

بلا شبہ "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے اور نودریافت نسخۂ دیوانِ غالب کا خط اور اندازِ کتابت بڑی حد تک ایک ہی ہے اور جہاں تہاں کچھ فرق ہے بھی تو اُسے، ان دونوں خطی نسخوں کے لکھے جانے کے درمیان جو زمانی فصل ہے، اُس کا قدرتی نتیجہ خیال کرنا چاہیے ۔

نودریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب کو زیادہ تر ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء اور بعض صورتوں میں ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کا لکھا ہُوا مانا گیا ہے ۔ "گلِ رعنا" کا زیرِ نظر مخطوطہ بالیقین ستمبر ۱۸۲۸ء کا لکھا ہوا ہے ۔ بارہ برس تو ایک خاصی مدت ہوتی ہے، اوائلِ عمر کے سات برس بھی کچھ کم نہیں ہوتے ۔ عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ طرزِ تحریر اور روشِ املا میں خفیف فرق پڑ جانا یا پیدا ہو جانا، کچھ تعجب خیز نہیں، لیکن غالب قبل از وقت پختہ ہو جانے والی فطرت لے کر پیدا ہوئے تھے، روشِ تحریر بھی ان کی جو بننا تھی، کم عمری ہی میں بن گئی اور یہ اتنی متعین تھی کہ اس میں عمر یا وقت کے ساتھ کسی انقلابی یا بنیادی تبدیلی کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی ۔ چنانچہ نودریافت دیوان اور "گلِ رعنا" کے ان خطی نسخوں کا، جو ان کے شباب کی یادگار ہیں، اُن کی اخیر عمر کی قلمی تحریروں سے، جس کی ایک بہت بڑی تعداد کے روشن عکس "مرقعِ غالب" (از : پرتھوی چندر) میں موجود ہیں، موازنہ کیا جائے تو کوئی ایسی بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی کہ خط کا مجموعی تأثر ہی بدلا بدلا نظر آئے ۔

"گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کا اندازِ خط اور املا، غالب کا اپنا معروف اور جانا پہچانا ہے ۔ اس میں اور غالب کے قلم سے اس سے پہلے اور بعد کی تحریروں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے ۔ یہ نستعلیق کے شفیعا خط کا اچھا نمونہ ہے اور باہتمامِ قلم سنبھال کر لکھا گیا ہے، اس لیے غالب کے خط سے ذرا بھی آشنا، عام شخص تک بلا تأمل کہہ سکتا

[اللہ] بحوالہ : نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۵۶۹

ہے کہ یہ غالب ہی کا خط ہے اور "گل رعنا" کا یہ نسخہ غالب کا خود نوشتہ ہے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ کو راقم الحروف نے "گل رعنا" کے چار صفحات کے عکس بھیجے تو انھوں نے یہ عکس مولانا امتیاز علی عرشی کے ملاحظے میں پیش کیے، موصوف نے بھی تصدیق فرمائی کہ:

"بلاشبہ، یہ غالب کا خط ہے[۱۱۵]۔"

اوائل مئی ۱۹۶۹ء میں مخطوطۂ "گل رعنا" کے آخری صفحے کا ایک عکس میں نے مالک رام کی خدمت میں بھی ارسال کیا تھا، ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے مرقومہ اپنے ایک خط میں جو بادہ دہلی سے لکھتے ہیں:

"آپ بھی کہیں گے کہ ۲۔ مئی کے خط کا جواب ۱۷۔ اکتوبر کو دے رہا ہوں، لیکن باور فرمائیے، یہ تاخیر اختیاری نہیں تھی، جن ایام میں آپ کا خط ملا ہے، میں بہت بیمار اور یہاں سے باہر جانے کی فکر میں تھا۔ میں ۱۳۔ مئی کو یہاں سے روس اور یورپ کے لیے روانہ ہوا..... جو عکس آپ نے روانہ کیا تھا، وہ غالب ہی کے ہاتھ کی تحریر کا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں — خود میرے پاس "گل رعنا" کا ایک نسخہ ہے، لیکن کسی کاتب کا لکھا ہوا۔"

مولانا امتیاز علی عرشی نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ غالب:

"اپنے عہد کے طرز کتابت کے مطابق یائے معروف و مجہول کے لکھنے میں بول چال سے زیادہ خطی خوش نمائی اور کاغذ پر باقی ماندہ جگہ کا لحاظ کرتے تھے۔ معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی جگہ معروف "ی" کا استعمال ان کے ہاں اتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں وقت اور تذکیر و تانیث کے متعین

---

[۱۱۵] ہماری زبان، علی گڑھ، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء، ص

کرنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے ۔[۲۳]

"گل رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے سے اس بیان کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے ۔ مثلاً مخطوطے کے صفحہ ۴۳ پر لفظ "ہے" سات بار استعمال ہوا ہے ، چھ جگہ غالب نے اسے یائے مجہول سے "ہے" لکھا ہے اور ایک جگہ بیائے معروف "ہی" رقم کیا ہے ۔ "کی" کا اِملا بیائے مجہول درج کیا ہے :

پھر شوق کر رہا ہے خریدار" کے" طلب

"تکے" کو بیائے معروف ضبط کیا ہے :

پھر دل میں ہے کہ در پہ کسو کی "پڑے رہیں

لیکن "تاکنا" مصدر سے "تاکے" ہے کو بیائے مجہول ہی لکھا ہے :

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے" ہے پھر نگاہ

دوڑے ، پڑے کو شکستہ یائے مجہول سے اس طرح لکھتے ہیں : ے ۔ مانگے ، بُرے ، بیٹھے کو یائے معروف سے : مانگی ، بُری ، بیٹھی لکھا ہے ۔ "سے" کو ایک شعر میں بیائے معروف "سی" لکھا ہے ، لیکن فوراً بعد دوسرے شعر میں بیائے مجہول "سے" رقم کیا ہے اور "ی" کے نیچے دو نقطے بھی لگائے ہیں :

چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اِس مصرعے میں "سے" کے نیچے بھی دو نقطے لگائے گئے ہیں ۔ سترہ اشعار کی اس مرصّع غزل میں اٹھارہ جگہ بطور ردیف "کیے ہوئے" آیا ہے ۔ غالب نے اسے جس طرح ضبط کیا ہے ، اس کا گوشوارہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا :

۱ ۔ کئے بیائے مجہول : سولہ بار

۲ ۔ کئی بیائے معروف : دو بار

---

[۲۳] دیباچہ ، مکاتیبِ غالب ، طبع چہارم ۱۹۴۹ء ، ص ۲۰

۳۔ ہُوے بیائے مجہول چودہ بار

۴۔ ہوی بیائے معروف تین بار

دوسری بات :"اُردو کے جن الفاظ میں الف یا واو مدّہ کے بعد "ی" واقع ہوتی ہے جیسے جائے یا ہُوے، میرزا غالب کی تحریروں میں ان کی کتابت کبھی یکساں نہیں ہے۔ وہ کبھی انھیں بے ہمزہ کے اور کبھی ہمزہ کے ساتھ "جائے"۔ "ہُوئے" لکھ دیتے ہیں[۲۴]۔"
[امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب، دیباچہ طبع چہارم ص۲۲۸]

"گُلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے میں بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً "ہوے" بغیر ہمزہ کے ساتھ اس مصرعے میں مُلاحظہ کیا جا سکتا ہے :

برسوں ہُوے ہیں چاک گریباں کیے ہوے

اور ہمزہ کے ساتھ، اس غزل کی ردیف میں سترہ بار آیا ہے، نیز اِس مصرعے میں "ہوئے" "ی" اور "ہمزہ" دونوں کے ساتھ لکھا ہے :

سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہُوئے

اسی طرح کہا گیا ہے کہ : "یائے مدّہ کے بعد "ی" ہو جیسے، لیے کیے تو یاے اوّل کو غالب کبھی بصورتِ ہمزہ، کبھی بصورتِ یا اور کبھی "ی" اور "ہمزہ" دونوں کے ساتھ لکھتے ہیں[۲۵]۔" لیکن "گُلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے میں غالب نے بالعموم یائے اول کو ہمزہ کے ساتھ لکھا ہے۔

تیسری بات : نودریافت دیوان میں غالب نے زاے فارسی "ژ" کی جگہ "ز" لکھا ہے۔ "گلِ رعنا" کے اس مخطوطے میں بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً :

مُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہُوئے (ص۳۳)

---

[۲۴] مولانا امتیاز علی عرشی، دیباچہ مکاتیبِ غالب، طبع چہارم، ص۲۲۸

[۲۵] مولانا امتیاز علی عرشی، ایضاً، ص۲۲۸

عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے (ص۴۳)

چوتھی بات : غالب "ڈ" اور "ڑ" پر "ط" استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً "گلِ رعنا" میں اشعارِ اُردو کے انتخاب کے آخری صفحے پر چار بار "ڈ" اور تین بار "ڑ" کا حرف آیا ہے، ساتوں جگہ ان حروف پر "ط" موجود ہے۔ لیکن "ٹ" اور "ٹھ" پر دو ہر جگہ "ط" کے بجائے چار نقطے :: لگاتے ہیں۔ "گلِ رعنا" کے اسی صفحے پر دو جگہ اُنھوں نے لفظ "بیٹھے" استعمال کیا ہے اور دونوں جگہ اس لفظ کو غالب نے اس طرح لکھا ہے : بیٹھے
نو دریافت دیوان میں بھی "ڈ" "ڑ" اور "ٹ" کی یہی صورت ہے اور آخر عمر تک ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ[۲۶] غالب کی تحریر کا یہ امتیاز قائم رہا۔

پانچویں بات : "گ" پر نو دریافت دیوان میں غالب نے دوسرا مرکز کہیں استعمال نہیں کیا اور ہر جگہ "گ" ہی املا کیا ہے۔ لیکن "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر نسخے میں دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ اس کا ایک جائزہ ملاحظہ ہو :

۱۔ دیباچے کا آخری صفحہ (فارسی نثر) : گزارد ، گیر ، گرمی ، دورنگ ، یک رنگ ، گفتنی ، نظارگیان ، جگر ، نگارش ، گزاردہ ، گوہر ، گل ، گلِ رعنا ، گوشہ اور گرامی ۔ ان پندرہ لغات میں سے صرف ایک جگہ "گزاردہ" پر "گ" کے دونوں مرکز ہیں، ورنہ ہر لفظ کو "ک" سے اِملا کیا گیا ہے۔

۲۔ اشعارِ اُردو کا آخری حصہ : صد گلستاں ، نگاہ ، مانگے ، مژگاں ، پھر نگاہ اور گلستاں ؛ ان چھ مقامات میں سے صرف ایک جگہ "مانگے" پر "گ" کے دونوں مرکز ہیں بقیہ پانچوں لفظوں کا

---

۲۶ مُرقّعِ غالب ، پرتھوی چندر ، حصہ دوم ، صفحہ ۲۳۶ پر غالب نے لکھا ہے "جز داد کمار ڈال" یہاں "ڈ" پر "ط" کی جگہ نقطے ہیں۔

املا "ک" سے کیا گیا ہے ۔

۳۔ آغاز فارسی کی تمہیدی سطور : رنگین ، گلِ رعنا ، افگن ، گہر ، پراگندہ ، فرہنگان ، آہنگان ، نگیرند ، سرمایگان ، ان نو صورتوں میں سے صرف ایک جگہ "نگیرند" پر "گ" کے دونوں مرکز ہیں ، ورنہ ہر موقع پر "ک" سے املا کیا ہے ۔

۴۔ گیارھویں فارسی غزل کا ایک مصرع : خود گیرد ، رنگِ گل ، میگردد ، بوئے گل ، گسستن ، گر ، گشتہ ، موسم گل ، سنگ ، آورگی ، گر ؛ ان گیارہ صورتوں میں "گر" اور "آورگی" کے علاوہ بقیہ آٹھ لفظوں کا املا "ک" ہی سے کیا گیا ہے ۔

اوپر کی مثالوں میں اکتالیس لفظوں میں سے صرف چھ پر غالب نے "گ" کے دونوں مرکز لگائے ہیں ، ورنہ ان کا غالب رجحان "گلِ رعنا" کی نگارش (۱۸۲۸ء) تک "گ" پر ایک مرکز ہی لگانے کا رہا ہے ۔ اس کے برعکس آخر عمر میں انھوں نے لازماً بالاظہار "گ" پر دو مرکز لگائے ہیں اور اس کا املا کہیں "ک" نہیں کیا ۔ انتقال سے کم و بیش آٹھ ماہ پہلے ۲۱ جون ۱۸۶۸ء کو انھوں نے "بقلم خود" نواب علائی کے نام ایک "توقیع" میں[۳۹] : "نگارش ، ہوگا ، زندگی ، گئی اور جگہ" وغیرہ غرض پوری تحریر میں "گ" پر ہر جگہ دو مرکز ہی لگائے ہیں ۔ اسی طرح انتقال سے قریب دو ماہ پہلے ۱۱ دسمبر ۱۸۶۸ء کے ایک مختصر سے خط بنام والیٔ رامپور[۴۰] میں ایک مقام پر "جائے گا" آیا ہے اور یہاں بھی غالب نے "گ" پر دو مرکز لگائے ہیں ۔

چھٹی بات : غنہ کا استعمال غالب کے ہاں نہیں ہے ۔ مثلاً ہیں ، رہیں ، میں ، ہیں ، نہیں وغیرہ میں بھی وہ بالالتزام نون کا نقطہ لگاتے ہیں ۔ ضرورتِ شعری سے بھی

۳۹؎ مرقع غالب ، پرتھوی چندر ، دہلی ۱۹۶۹ء حصہ دوم ، ص ۳۰ ۔ ۴۰؎ مرقع غالب ، ایضاً ، ص ۲۵۲

جہاں "ن" بالاعلان نہیں، وہاں بھی وہ نون کا نقطہ ضرور لگاتے ہیں، مثلاً :

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

اس غزل کے قافیے میں نون غنّہ چاہیے، لیکن غالب نے اس پوری غزل کے قوافی میں "ن" بالاعلان درج کیا ہے۔ "ن" کے اظہار کی یہ صورت غالب نے اپنی تحریروں میں آخر عمر تک قائم رکھی۔

ساتویں بات : غالب "دال" سے ماقبل "الف" اور "دال" کے بعد آنے والی "ہائے ہوز" کو ملا دیتے ہیں، مثلاً "بادہ" کو ایسے لکھیں گے " بادہ " — "گلِ رعنا" میں فارسی غزل کے اس مصرعے :

بموج بادہ ماند پرتوِ شمعِ مزارِ ما

میں "بادہ" کو غالب نے اسی طرح بخطِ شکستہ ملا کر لکھا ہے۔

آٹھویں بات : غالب "دال" یا "ذال" اور "واؤ" کو بھی اکثر ملا کر لکھتے ہیں، مثلاً "ذوق" کو وہ ایسے لکھیں گے : ذوق — "گلِ رعنا" میں مندرج محولہ بالا فارسی بیت کے مصرعۂ اولیٰ :

ہنوز از مستیِ ذوق تو می بالد تماشائے

میں "ذوق" کے ذال اور واؤ کو تصریح بالا کے مطابق ملا کر املا کیا گیا ہے۔ لفظ "دوم" میں "دال" اور "واؤ" کو ملا کر لکھا ہے، مثلاً دیباچے کے آخر میں :

" در دوم چوں آغوشِ شوق بروئے پارسیان وا ست "

اور ایک جگہ صفحہ ۴۳ پر "دوم" لکھتے ہوئے "دال" اور "واؤ" کو الگ صاف صاف بھی رقم کیا ہے :

" در دوم این رنگین چمن موسوم بہ "گلِ رعنا" . . . . "

نویں بات : "کہ" (کاف اور ہائے ہوز) کو بھی غالب کبھی بخطِ شکستہ "کہ" لکھتے ہیں

اور کبھی صاف "کہ"

دسویں بات : بعض حروف کے علاوہ، الفاظ کو ملا کر لکھنا بھی غالب کی روش خاص ہے۔ نو دریافت دیوانِ اُردو میں بھی یہ صورت ہے اور "گل رعنا" کے زیرِ نظر نسخۂ غالب میں بھی یہی عمل نظر آتا ہے، مثلاً: "دل میں" کو یوں لکھا ہے : "دمیں" اسی طرح "مقابل میں" کو "مقابلمیں" "زچھیڑ" کو "نچھیڑ" اور "گناہوں کی" کو "گناہونکی" وغیرہ۔

گیارھویں بات : "پ" اور "چ" کے نقطے کہیں کہیں تو قلم سنبھال کر اس طرح لگاتے ہیں کہ تینوں نقطوں کا الگ الگ اظہار ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں یہ نقطے اس طرح ضبط میں آتے ہیں کہ ان کی شکل انگریزی میں سوالیہ کی بلا نقطہ علامت (؟) کی سی بن جاتی ہے۔

بارھویں بات : مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ غالب کی : "تحریروں میں پُرانی علامات اوقات کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (ط) لکھتے ہیں جو لفظ "فقط" کی طغرائی شکل ہے"[39] نو دریافت دیوان میں یہ علامت کم و بیش اسی صورت میں دو جگہ استعمال ہوئی ہے[40] غالب کی بعد کی بعض تحریروں میں بھی اسے دیکھا جا سکتا ہے[41] "گل رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے میں بھی یہ علامت

---

۳۹ دیباچہ، مکاتیب غالب طبع چہارم، ص ۴۳

۴۰ (الف) نقوش، لاہور غالب نمبر ۲، ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۰ و ۲۹۶

(ب) دیوانِ غالب بخط غالب نسخہ عرشی زادہ، دہلی ۱۹۶۹ء ص ۱۲۱ کالم ۲ و ص ۱۲۵ آخری سطر۔

۴۱ مرقع غالب (پرتھوی چندر) کا پہلا حصہ ص ۱۹۲ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے حصے پر جو اسی مجلد میں ہے، صفحات کے نمبر نہیں ڈالے گئے، حصہ دوم کو، جس میں غالب کے نوشتہ خطوط وغیرہ کے عکس شامل ہیں، اگر ص ۱۹۳ سے سلسلہ وار نمبر دیں تو "مرقع غالب" کی مجموعی ضخامت ۳۰۰ صفحات پر تمام ہوگی۔ ان ڈالے گئے صفحات کے مطابق "فقط" کی یہ طغرائی علامت صفحہ ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۱۸، ۲۳۴، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۶۴، ۲۷۳، ۲۷۸، ۲۹۶ اور صفحہ ۲۹۸ وغیرہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

دیباچے کے آخر میں آئی ہے لیکن یہاں اس کی شکل انگریزی حرف "ج" (جی) سے مشابہ ہے یعنی پانچ (۵) کے ہندسے کی اُفقاً الٹی تری شکل جبکہ ہندسے کا مرکز نیچے کے بجائے بائیں ہو۔

تیرھویں بات: غالب کی خود نوشتہ تحریروں میں ہائے مخلوط دو چشمی "ھ" کی جگہ ہائے سادہ کی شکل ملتی ہے[۳۱]۔ "گلِ رعنا" میں بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً: انتخابِ اُردو کے آخری صفحے پر نو (۹) بار لفظ "پھر" آیا ہے اور ہر جگہ غالب نے اس کا املا ہائے سادہ سے "پہر" کیا ہے۔ اسی صفحے پر "کھولنا" کو کہولنا، "چھیڑ" کو چہیڑ اور "بیٹھے" کو بیٹہی (بیائے معروف) لکھا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی کا بیان ہے کہ غالب "ان لفظوں میں بتاکید ہائے مخلوط لکھواتے تھے، جن میں بول چال کے اندر "ھ" موجود ہے، مثلاً: نواب ناظم کے مسودے میں کاتب نے "ڈھونڈا" لکھا تھا، میرزا صاحب نے اسے "ڈھونڈھا" بنا دیا ہے[۳۲]۔" ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے بھی ایک موقع پر یہی فرمایا ہے کہ غالب "تڑپھنا" کی طرح "ڈھونڈھتے" لکھتے ہیں[۳۳]۔" گلِ رعنا کے زیرِ نظر خطی نسخے میں غالب نے صفحہ ۴۳ پر یہ لفظ "ڈھونڈنا" دو جگہ ہائے مخلوط دو چشمی کے بجائے ہائے سادہ سے لکھا ہے:

ڈھونڈہے ہے پہر کسی کو مقابلمیں آرزو

یا:

جی ڈہونڈہتا ہے پہر وہی فرصت کہ رات دن

---

[۳۱] مولانا امتیاز علی عرشی، دیباچہ مکاتیبِ غالب، طبع چہارم، ص ۲۲۰

[۳۲] دیباچہ مکاتیبِ غالب، طبع چہارم، ص ۲۰۰

[۳۳] مُقدمہ خطوطِ غالب، ۱۹۴۱ء، بحوالہ: مکاتیبِ غالب (عرشی)، طبع دوم ۱۹۴۳ء، ص ۲۰۶

چودھویں بات : لفظ "کسی" اور "کسو" کی منطق کے بارے میں ہے۔ غالب نے ایک موقع پر "کسی" کو بمقابلہ "کسو" فصیح بلکہ افصح قرار دیا ہے۔ اپنے اُردو دیوان کی تیسری اشاعت (جولائی ۱۸۶۱ء) کے خاتمے میں غالب لکھتے ہیں :

"داد کا طالب، غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔۔۔
۔۔۔ ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف، غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں، ایک لفظ میری منطق کے خلاف، نہ ایک جگہ، بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے، کہاں تک بدلتا، ناچار یوں ہی چھوڑ دیا — یعنی "کسو" بہ کاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں، البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح "کسی" ہے واؤ کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ "کسو" بہ واؤ ہے[۵۵]، اور سب جگہ "کسی" بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے[۵۶]۔۔۔۔"

لیکن، غالب کی اس صریح قرارداد کے برعکس "گلِ رعنا" کے اس نسخے میں ایک سے زیادہ

---

۵۵ "کسو" کے قافیے کے ساتھ غالب کے اُردو دیوان کا واحد شعر یہ ہے :

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے ٭ یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی

اس غزل کا قدیم ترین ماخذ "نسخۂ شیرانی" (۱۸۲۶ء) ہے۔ گویا "گلِ رعنا" کی تسوید (۱۸۲۸ء) سے پہلے وہ یہ غزل کہہ چکے تھے۔ نسخۂ شیرانی میں یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ متداول دیوان میں اس غزل کے اشعار کی تعداد پانچ رہ گئی ہے۔ "گلِ رعنا" میں بھی یہ غزل شامل ہے لیکن صرف چار اشعار انتخاب کیے گئے ہیں۔ ان چار میں سے ایک شعر "کسو" کے قافیے والا بھی ہے، مگر مصرعۂ ثانی کی شکل یہ ہے :

صاحب! کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی

"نسخۂ شیرانی" میں بھی مصرعے کی یہی صورت ضبط میں آئی ہے۔

۵۶ دیوانِ غالب، طبع سوم مطبع احمدی واقع شاہدرہ، دہلی، جولائی ۱۸۶۱ء ص ث، بحوالہ: مالک رام، مقدمہ دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، دہلی، صفحہ ۲۳

جگہ قافیے کے علاوہ "کسو" خود غالب کا اپنے قلم سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ مثلاً: حصۂ اُردو کی آخری غزل کے بارھویں شعر میں "کسو" (بہ کاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف) بجائے "کسی" آیا ہے:

مانگے ہے پھر "کسو" کو لبِ بام پر ہوس

تیرھویں شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں بھی غالب نے "کسی" (واؤ کی جگہ یائے تحتانی) کے بجائے "کسو" لکھا ہے:

ڈھونڈے ہے پھر "کسو" کو مقابل میں آرزو

اسی غزل کے سولھویں شعر[۳۷] کے مصرعۂ اولیٰ میں بھی غالب نے "کسی" کی جگہ "کسو" ہی لکھا ہے:

پھر دل میں ہے کہ در پہ "کسو" کے پڑے رہیں

گویا "کسو" کے مقابلے میں "کسی" کو فصیح بلکہ "افصح" ٹھہرانے والی منطق غالب کی اخیر عمر کی قرار داد ہے اور "گُلِ رعنا" کی نگارش (۱۱-ستمبر ۲۸ء) کے زمانے میں ابھی وہ اس منطق تک نہیں پہنچے تھے۔

پندرھویں بات: "ہائے مختفی پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کو تحریف کی حالت میں بالعموم "ی" کے ساتھ بولا اور "ہ" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ "کعبہ کی دیوار" اور "غصہ کی بات" کو کعبے کی دیوار اور غصّے کی بات بولتے ہیں۔ خطوط میں (غالب) نے بھی زیادہ تر اسی رواجِ عام کی پیروی کی ہے لیکن انتخابِ اُردو (قلمی) میں تین چار جگہ اور ناظم دیباب کے مسودوں میں ایسے تمام الفاظ کی "ہ" قلم زد کر کے، اس کی جگہ "ی" بنا دی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر تلفظ کے مطابق املا کو پسند کرتے تھے... لیکن ہائے مختفی پر ختم ہونے والے ہندی یا ہندالفاظ کی کتابت میں مرزا غالب ایک روش کے پابند نہ تھے[۳۸]"

---

[۳۷] متداول دیوان میں باعتبار ترتیب یہ پندرھواں شعر ہے۔

[۳۸] مولانا امتیاز علی عرشی، دیباچہ مکاتیب غالب، طبع چہارم، ص ۲۲۶

چنانچہ ان اسماء میں جو فارسی ترکیب میں واقع ہوں، غالب نے زیادہ تر "ہ" برقرار رکھی ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی کے بقول: "بیتاب نے" گل ولالے "لکھا تھا، میرزا صاحب نے اسے قلمزد کر کے" گل ولالہ بنایا ہے[۴۹]۔ "گلِ رعنا" کے مخطوطے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل شعر میں غالب نے "گل ولالہ ہی لکھا ہے:

دوڑے ہے پھر ایک گل ولالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

سولھویں اور اس سلسلے کی آخری بات: غالب "ذ" کو عربی کے مخصوص حرفوں میں شمار کرتے تھے اور مولانا امتیاز علی عرشی کے بقول: "کبھی کسی فارسی لفظ میں" ذ "نہیں لکھتے تھے[۵۰]۔" غالب کے زمانے میں گزشتن، پذیرفتن الفاظ کو" ذ "سے لکھا جاتا تھا۔ غالب نے اس پر اعتراض کیا کہ" ذ "عربی ہے۔ متحد المخرج یا قریب المخرج یعنی متشابہ الاصوات حروف فارسی میں نہیں۔ صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

"خواجہ نصیر الدین طوسی[۵۱]، آٹھ حرف کا زبانِ فارسی میں نہ آنا لکھتے ہیں اور" دال "نقطہ دار کا ذکر نہیں کرتے۔ اِلّا کوئی لغت فارسی ایسی بتائیے جس میں" ذال "آئی ہو؟ گزاشتن و گزشتن و پزیرفتن سب" زے " سے ہے۔ کاغذ دال مہملہ سے ہے، اس کا" ذال "سے لکھنا اور کواغذ کو اس کی جمع قرار دینا تعریب ہے، نہ تحقیق... کوئی لفظ متحد المخرج فارسی میں نہیں بلکہ قریب المخرج بھی نہیں۔" تے "بے" طوے "نہیں،" سین "ہے" ث "نہیں اور" صاد "نہیں۔" ہائے

---

[۴۹] دیباچہ مکاتیب غالب، طبع چہارم، ص ۲۰۳

[۵۰] دیباچہ مکاتیب غالب، طبع چہارم، ص ۲۲۳

[۵۱] یعنی "محقق طوسی" مصنف: "اخلاق ناصری" اور "معیار الاشعار" وغیرہ۔ ولادت: ۱۲ فروری ۱۲۰۱ء، وفات: ۲۶ جون ۱۲۷۴ء۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون "محقق طوسی" از: فاضل لکھنوی، الواعظ، لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۰ء و جولائی ۱۹۵۱ء

ہوز" ہے "حائے حطی" نہیں، یہاں تک کہ "قاف" نہیں، اس راہ سے کہ "عین" متحد المخرج بلکہ قریب المخرج ہے، "زے" کے ہوتے "ذال" کیوں کر ہوگی[۴۲]"

"گذشتن، پذیرفتن، وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات میں جہاں "ذ" مروج ہے، مرزا غالب نے "ز" استعمال کی ہے[۴۳]" لیکن اکبر علی خاں عرشی زادہ کا کہنا ہے کہ گو:

"غالب، فارسی میں حرف "ذال" کے قائل نہ تھے مگر اُن کا یہ نظریہ بہت بعد کا ہے، اِس لیے قدیم تحریروں میں بہت سے ایسے الفاظ جن میں بعد کو "ز" لکھا کرتے تھے، "ذال" پائی جاتی ہے۔ یہی صورت زیرِ نظر نسخے (نو دریافت دیوانِ غالب اُردو) کی ہے[۴۴]"

عرشی زادہ کا یہ کہنا کہ "یہ نظریہ بہت بعد کا ہے" محلِ نظر ہے، اس لیے کہ "گلِ رعنا" کے مخطوطے میں غالب نے اُن فارسی مصادر کے مشتقات میں جہاں "ذال" مروج ہے "ز" ہی استعمال کی ہے۔ دیباچے کے آخری صفحے میں لکھتے ہیں:

(۱) "پشت دستے بر زمین میگزارد۔۔۔"

(۲) "از روے بزبان گفتنی وازمن بجان پزرفتنی بر دل سخن پزیر سخن دل پزیر"

(۳) "۔۔۔۔ ہمان جادہ گزاردہ آمد۔۔۔"

"درِدوم" کی تمہیدی سطور اس جملے پر ختم ہوتی ہیں:

"۔۔۔ بے دماغانِ عالم فرصت بپزیرند۔"

روشِ املا اور اندازِ خط کی ان مثالوں میں کچھ ایسی ہیں جو "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے سے خاص ہیں، پہلے نہیں تھیں، بعض آئندہ بھی جاری رہیں۔ بایں ہمہ قدیم طرزِ نگارش،

---

۴۲ عودِ ہندی، مرتبہ: فاضل لکھنوی، لاہور، جون ۱۹۶۷ء، ص ۵۳، ۵۴

۴۳ مولانا امتیاز علی عرشی، دیباچہ مکاتیبِ غالب، طبع چہارم، ص ۲۲۳

۴۴ مقدمہ، دیوانِ غالب اُردو بخطِ غالب، نسخہ عرشی زادہ، دہلی ستمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۰

اس مخطوطے میں موجود اور مابعد اندازِ خط ہیں، مغائرت تامتر قطعاً نہیں بلکہ اس کے برعکس یکسانیت کی پرچھائیوں اور غالب کی آشنا روش کا ہر جگہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

"گلِ رعنا" کا یہ زیرِ بحث، اہم ترین، قابلِ قدر، لائقِ اعتبار اور بے بہا نسخہ جس کی دریافت اور نشاندہی کی عزت راقم الحروف کو حاصل ہوئی، جناب خواجہ محمد حسن[۵۶] کی ملکیت ہے جنھیں کوئی نصف صدی سے اس نسخے کے تملک کا شرف حاصل ہے اور یہ تبرک اُنھیں اپنے نانا خواجہ احمد اللہ مرحوم[۵۷] سے ورثے میں ملا۔

"گلِ رعنا" کا یہ قلمی نسخہ بخطِ غالب ہے اور یہ خصوصیت، بجائے خود اس نسخے کو دیگر معلوم نسخوں پر امتیاز بخشتی ہے۔ اس مخطوطے کی ایک دوسری وجہ امتیاز اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے پہلی بار، اس انتخاب کی تاریخ ترتیب معلوم ہوتی ہے جو دیگر مآخذ میں ناقص رہ گئی ہے۔ "گلِ رعنا" کے نسخے مخزونہ مالک رام میں جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، مولانا امتیاز علی عرشی کے بقول :

"سالِ انتخاب ناقص رہ گیا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ قیامِ کلکتہ کا کارنامہ

۵۶؎ خواجہ محمد حسن صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں؛ وہ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت امرتسر سے ہجرت کرکے لاہور آئے اور معروف کاروباری زندگی بسر کرنے کے بعد ایک طرح سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں، لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود توانائی اور قوتِ عمل کے اعتبار سے اُن کی زندگی آج کل کے نوجوانوں سے زیادہ بھرپور ہے۔ خواجہ صاحب کے تین صاحبزادے ہیں اور ماشاء اللہ تینوں عملی زندگی میں بڑے کامیاب ہیں۔ سب سے بڑے تجمل حسین مرچنٹ، ایئر فورس میں ونگ کمانڈر ہیں۔ منجھلے خالد حسن، بہت اچھے آرٹسٹ ہیں اور مستقلاً لندن میں بس گئے ہیں۔ چھوٹے حسن طارق، پاکستان کے مشہور فلم ڈائرکٹر ہیں اور لاہور ہی میں آباد ہیں۔

خواجہ احمد اللہ مرحوم امرتسر میں کشمیری شالوں کے بہت بڑے سوداگر تھے اور اپنے اس کاروبار کے سلسلے میں ان کا اکثر دلّی آنا جانا رہتا تھا۔ انھوں نے ۸۵ اور ۹۰ برس کے درمیان عمر پائی اور ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔

ہے جو ۴۔ شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹۔ فروری ۱۸۲۸ء) سے شروع ہو کر ربیع الاوّل ۱۲۴۵ھ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں ختم ہوا تھا۔[۶]

خود مالک رام نے اپنے گرامی نامے مورخہ ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں مجھے تحریر فرمایا کہ:

"میرے پاس "گُلِ رعنا" کا ایک نسخہ ہے لیکن کسی کاتب کا لکھا ہوا۔ میں قیاس کرتا ہوں کہ اس کی نقل میں تو کوئی غلطی نہیں ہو گی، بدقسمتی سے اس میں دیباچے کے آخر میں تاریخ نہیں دی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے نسخے کے دیباچے کی تاریخ کتابت سے مطلع فرمائیں؟۔"

"گُلِ رعنا" کے قلمی نسخے، بخطِ غالب میں، غالب نے دیباچے کے آخر میں غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ کی تاریخ درج کی ہے جو عیسوی شب و روز ماہ و سال کے مطابق منگل ۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء ہوتی ہے۔ اس طرح "گُلِ رعنا" کی تاریخ تالیف پہلی بار سامنے آرہی ہے اور یہ اطلاع ادبِ غالب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں:

"یہ امر بطور خاص توجہ طلب ہے کہ "اشاریۂ غالب" (از سید معین الرحمٰن) میں اس نسخۂ "گُلِ رعنا" کے چار صفحوں کا عکس چھاپا گیا ہے جو خود میرزا غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اس سے پہلی مرتبہ "گُلِ رعنا" کی ترتیب کی قطعی اور مستند تاریخ منظرِ عام پر آئی یعنی غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء۔۔ دیکھیے: ضمیمہ اشاریۂ غالب، صفحہ ۳۹۹ تا ۴۰۰"[۷]

"غالب، ۲۱۔ فروری ۱۸۲۸ء (۴۔ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو (پنشن کی تقسیم کے قضیے کے سلسلے میں) کلکتے پہنچے۔ یہاں پہنچ کر اُنھوں نے ۲۸۔ اپریل ۱۸۲۸ء کو اپنی درخواست گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کی تو

---

[۶] دیباچہ دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، ص ۲۱

[۷] (۱) سہ ماہی اُردو ادب، علی گڑھ، شمارہ ۳، ۱۹۷۰ء ص ۱۶۲
(۲) نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۲۱۳

دائرهٔ هر حرف سر از حلقهٔ دامی بر می‌آرد و کلکم از عجز تحریر در کشش هر نقطه

پشت دست بر زمین میگذارد اما خوشتر می‌انداز مهربانیش نازم که آتش

افسردهٔ مرا شعله در رشته و خاک نشین گهر مرا علم رعنائی غبار ارزانی داشت

فرمان داده است که منتخبی از دیوان ریخته و غزلی چند از پارسی در یک سفینه

با هم درآرم و این پردهٔ دو رنگ دستاویز بینش نظارگیان یکرنگ از وی

از وی بزبان گفتنی و از من بجان پذیرفتنی بر دل سخن پذیر سخن دلپذیر جوی

دیده وران دانشمند نهفته مبادا که چون در آغاز خارخار جگر کاوی شوقم

همه صرف نگارش اشعار اردو زبان بود در مسلک این تحریر نیز همان جاده

گزارده آمد و همان راه سپرده شد که مبادا سر رشته از کف رود و کار از پرکار فتد

هر آئینه این چمنستان را دو در روبروی هم گشودم نخستین در را به اشعار هندی

بگوهر آموده‌ام و در دوم را چون آموزش شوق بروی پارسیان واداشت و نام این

سفینه بزبان آشناسان گل رعنا آمد الهی این گل رعنا را گوشهٔ دستار

قبول جا دهی و هر که این را گرامی نهد سپاس از وی پذیرفتنی الله بس ما سوی

هوس محرره غرهٔ ربیع الاول سنه ۱۲۴۴ هجری

[" گل رعنا " بخطِ غالب (۱۸۲۸ء) کے دیباچے کا آخری صفحہ جس پر " گل رعنا "

کی تاریخ غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری درج ہے]

انھیں دفتر کی طرف سے حکم موصول ہوا کہ "یہ پہلے دلی میں انگریز ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ اُس کی رپورٹ پر یہاں مناسب کارروائی کی جائے گی"۔ میرزا غالب کے لیے یہ ناممکن تھا کہ واپس دلی آتے اور پھر دوبارہ ہفت خواں طے کر کے کلکتے پہنچتے۔ اس لیے وہ خود تو کلکتے ہی میں رہے اور دلی ریذیڈنسی میں مقدمے کی پیروی کے لیے خط کے ذریعے سے ولہ ہیرالال کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ اُن دنوں دلی میں سر ایڈورڈ کولبرک ریذیڈنٹ تھے۔ کولبرک صاحب نے ۲۴۔ فروری ۱۸۲۹ء کو اُن کے حق میں رپورٹ صدر کو بھیج دی جس میں اُن کے دعوے کی تائید تھی۔ دلی سے ابتدائی رپورٹ کے حاصل کرنے ہی میں دس مہینے کا طویل زمانہ گزر گیا اور میرزا یہ سارا عرصہ بے کار کلکتے میں بیٹھے رہے"[۹] (مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۶۹-۷۲)

اس "بیکاری" لیکن بے کلی کے زمانے میں غالب نے ۱۱۔ ستمبر ۱۸۲۸ء کو "گُلِ رعنا" ترتیب دی۔ یہ تاریخ "گُلِ رعنا" کے دیباچے کی ہے۔ خاتمے پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ یہ انتخاب بہت ضخیم نہیں ہے، اس لیے اگر ۱۱۔ ستمبر ۱۸۲۸ء کو آغازِ کار کی تاریخ فرض کر لیا جائے تو بھی اس انتخاب کی ترتیب اور نقل کا کام ۱۸۲۸ء ہی میں انجام پا گیا ہوگا، کیونکہ غالب اس عرصے میں بیکار تھے اور پھر ایک صادق الولا دوست، مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش تھی، بنا بریں تعمیلِ ارشاد میں تاخیر روا نہ رکھی گئی ہوگی۔ لیکن اس قیاس آرائی کی گنجائش اسی صورت میں ہے کہ ۱۱۔ ستمبر ۱۸۲۸ء کو کارِ نقل کے آغاز کی تاریخ پر اصرار کیا جائے، ورنہ زیادہ قرینِ قیاس حقیقت یہی ہے کہ "گُلِ رعنا" کی تحریر و ترتیب کے بعد دیباچہ لکھا گیا؛ جیسا کہ تصنیف و ترتیب کے کام سے متعلق اصحاب کا قدرتی طور پر ہمیشہ سے بالعموم شیوہ رہا ہے۔ غالب نے دیباچے میں اس مجموعے کا جس انداز اور جن کلمات میں تعارف کرایا ہے، اس

---

[۹] مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، ص ۶۹-۷۲

سے یہی ظاہر بھی ہوتا ہے ۔

"گلِ رعنا" کا یہ بیاض نما مخطوطہ (ایک ورق کے بقدر ناقص الاوّل) ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اصل مخطوطے کا سائز سات انچ طول میں اور چار انچ عرض میں ہے۔ کسی صفحے پر کوئی جدول نہیں ۔ کنارے سے کچھ ہی اندر کی طرف عبارت شروع ہو جاتی ہے۔ کتاب کا مسطر دیباچے اور خاتمے کی فارسی نثری تحریروں میں بالعموم چودہ سطری ہے ۔ انتخاب کلام کی روش تحریر زیادہ تر دائیں سے بائیں سیدھی اور صاف ہے اور سترہ سطری مسطر پر ہے ۔ لیکن یہ روشِ تحریر بعض صورتوں میں ترچھی مربّع نما بھی ہے اور کہیں کہیں دو کالمی بھی ۔ اس صورت میں مسطر کا لحاظ ممکن نہ تھا ، لیکن یوں بھی مسطر کی پابندی سختی سے کی ہی نہیں گئی ۔ یہ کئی جگہ ٹوٹ ٹوٹ گئی ہے ۔

اکثر ہلکے آسمانی یا بادامی رنگ کا بدیسی کاغذ ، غالب کے زیرِ استعمال رہا ہے ۔ اس مخطوطے کا کاغذ بھی ہلکا بادامی ہے ، ممکن یہ کبھی سفید رہا ہو لیکن اب کہنگی کے آثار ظاہر ہیں اور رنگ بادامی یا اصلاً ہی تھا ، یا اب ہو گیا ہے ۔ مخطوطے کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے ، اوراق کے کنارے مڑ گئے ہیں ، بعض صورتوں میں جھڑ بھی گئے ہیں ، روشنائی سیاہ استعمال کی گئی ہے ۔

اس مخطوطے کے ابتدائی پانچ صفحات میں غالب کا فارسی نثر میں دیباچہ آیا ہے دیباچے کے اس قلمی متن کی قرأت "پنج آہنگ" (۱۸۴۹ء) اور "کلیاتِ نثرِ غالب" (۱۸۶۸ء) میں شامل "دیباچۂ گلِ رعنا" کے مطبوعہ متن سے خاصی مختلف ہے ۔ اس قلمی دیباچے میں عبارت کے بعض ٹکڑے مطبوعہ سے زیادہ ہیں اور اہمیت کے حامل ہیں ۔ یہاں دیباچہ مخطوطۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے صفحۂ آخر کا متن بطور مثال پیش کیا جاتا ہے ۔ حواشی میں "پنج آہنگ" طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی اپریل ۱۸۵۳ء اور "کلیاتِ نثرِ غالب" طبع اوّل ، مطبع نولکشور ، لکھنؤ جنوری ۱۸۶۸ء کے اختلافات نسخ درج کیے جا رہے ہیں :

"..... دائرهٔ هر حرف سر از حلقهٔ دامے برمے آرد و کلکم از عجزِ تحریر[۵۰] در کسوتِ هر نقطه پشتِ دستے بر[۵۱] زمین میگزارد* آما[۵۲] خونِ گرمیِ اندازِ مهربانیش را نازم که آتشِ افسردهٔ[۵۳] مرا شعله در ساخت و خاک زمین گیرِ مرا عَلَمِ رعنائیِ غبار اَرزانی داشت فرمان داده است که[۵۴] منتخبے از دیوانِ ریخته و غزلے چند از پارسی در یک سفینه باهم درآمیزم و این پردهٔ دو رنگ به پیشِ طاقِ بینشِ نظارگیانِ[۵۵] یک رنگ آویزم از وے بزبان گفتنی و از من بجان پزرفتنی[۵۶] بر دل[۵۷] سخن پزیر* سخن دلپزیر* جوئ دیده وران دانشمند نهفته ممانادکه چون در آغازِ خارخارِ جگرکاویِ شوقم همه صرفِ نگارشِ اشعارِ اُردو زبان بود در مسلکِ این تحریر نیز همان جاده گزارده* آمد[۵۸] و همان را سپرده شد که مباد[۵۹] سررشته از کف رود و کار از پیه کار اُفتد هر آئینه این چمنستان را دو در رو[۶۰] بروئے هم کشودم و[۶۱] نخستین در را به اشعارِ هندی گوهر آمودم

---

* گزاردن اور پزیرفتن وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات میں جہاں "ذال" مروج ہے، غالب "ز" کے قائل تھے۔ "گلِ رعنا" میں ان الفاظ کا املا غالب نے "ز" ہی سے کیا ہے۔

۵۰ پنج آہنگ، طبع دوم، دہلی، اپریل ۱۸۵۳ء (= پ): "از عجزِ تحریر" ندارد
کلیاتِ نثرِ غالب، طبع اول، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء (= ک): "از عجزِ تحریر" ندارد

۵۱ پ، ک: "به" بجائے: بر — ۵۲ پ، ک: "آما" ندارد

۵۳ ک: "فشردہ" بجائے: افسردہ — ۵۴ پ، ک: "تا" بجائے: کہ

۵۵ پ، ک: "نظارگیانِ یکرنگ" ندارد

۵۶ پ، ک: "پذیرفتنی" بجائے: پزرفتنی، نیز پ میں اسے "ز" سے لکھا گیا ہے، ک میں "ذ" سے۔

۵۷ پ، ک: "بر دل سخن پزیر سخن دلپزیر جوئ دیدہ وران دانشمند نہفتہ ممانادکہ" ندارد

۵۸ پ، ک: "آمد" ندارد

۵۹ پ، ک: "کہ مباد سررشتہ از کف رود و کار از پیہ کار اُفتد" ندارد

۶۰ پ، ک: "رو" ندارد — ۶۱ پ، ک: "و" ندارد

در دوم[62] چون آغوش شوق بروے پارسیان واست و نام این سفینہ
بزبان ادا شناسان گل رعنا ۔ الٰہی این گلِ رعنا را بگوشہ دستار قبول
جادہی و ہرکہ این را گرامی نہد، سپاسے از وے برمن نہی، اللہ
بس وماسوی[63] ہوس ۔ محررہ غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری[64] لہ

غالب نے اس "چمنستان" یعنی انتخاب کو دو "دروں"، دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔
پہلا حصّہ "اشعارِ اُردو" کے انتخاب پر مشتمل ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ میں نے چونکہ
ریختہ میں شعر گوئی کا آغاز کیا، اس لیے اسی سے آغازِ کتاب کیا، دوسرے حصّے یعنی
در دوم میں فارسی اشعار کا انتخاب درج کیا ہے، اور اس "سفینے" کا نام بزبانِ اداشناساں
"گل رعنا" رکھا گیا۔

زیرِ نظر مخطوطے میں دیباچے کے ابتدائی پانچ صفحات کے بعد صفحہ ۶ سے "یا اسداللہ الغالب"
کا عنوان دے کر اُردو اشعار کا انتخاب ہے۔ پہلی غزل، غالب کی وہی معروف غزل ہے جس
سے اُن کے متداول اُردو دیوان کا آغاز ہوتا ہے:

نقش، فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

صفحہ ۶ سے شروع ہوکر صفحہ ۳۴ پر اُردو اشعار کا یہ انتخاب: "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے
ہوئے" والی مرصّع غزل پر تمام ہوتا ہے۔ یہ غزل ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء کے نو دریافت دیوانِ غالب
بخطِ غالب میں موجود نہیں۔ "نسخۂ حمیدیہ" مکتوبہ ۱۸۲۱ء کے آخر میں "خاتمۂ دیوان" کے بعد
جلد ساز نے جو سادہ اوراق لگائے ہیں، اُن میں پانچ صفحوں پر بدخط اور غلط نگار کاتب نے

---

۶۲ پ، ک: "دو یمین در" بجائے: در دوم
۶۳ پ، ک: "باقی" بجائے: و ماسوی
۶۴ پ، ک: "محررہ غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری لہ" ندارد

(جو سات) غزلیں نقل کی ہیں[۲۵]۔ اُن میں یہ آخری غزل ہے اور "گُلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کے برعکس جس میں یہ پوری غزل موجود ہے، "نسخۂ حمیدیہ" میں سترہ کی جگہ سولہ شعر نقل ہوئے ہیں۔ محذوف شعر یہ ہے[۲۶]:

پھر گرمِ نالہائے شرر بار ہے نفَس
مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے[۲۶]

یہ پوری غزل "نسخۂ شیرانی" (۱۸۲۶ء) کے متن میں ورق ۹۹ ب اور ۱۰۰ الف پر مندرجہ بالا محذوف شعر سمیت موجود ہے۔ مخطوطۂ گلِ رعنا کے صفحہ ۴۳ پر "مہماں کیے ہوئے" والی غزل کے یہ نو شعر آئے ہیں*:

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسو کو لبِ بام پر ہوس[۲۷]
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

---

[۲۵] پروفیسر حمید احمد خاں، نسخۂ حمیدیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸

[۲۶] "نسخۂ حمیدیہ" سے محذوف یہ "نسخۂ شیرانی" میں باعتبارِ ترتیب غزل کا چوتھا شعر ہے جبکہ نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب (ص ۳۲) میں یہ تیسرا شعر ہے۔

* یہاں اشعار درج کرتے ہوئے غالب کے املا کی پابندی نہیں کی گئی۔

[۲۷] نسخۂ حمیدیہ: ڈھونڈے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
نسخۂ شیرانی: ڈھونڈھے ہے پھر کسو کو لبِ بام پر ہوس
متداول دیوان: مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسو کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

ڈھونڈے ہے پھر کسو کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

پھر دل میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

سخن‌سنجانی را دوم این رنگین چمن موسوم به گلِ رعنا و عرضِ مذاقِ زبان آگاه
که سرمایهٔ حریف افگن است و بادهٔ مرد آزما از آنجا که سبزه زارِ این گلشن نشاط بود
برشتهٔ نظمِ حروف تهی گسسته‌ام و این اوراقِ پراکنده رشته از جمعیت
نسخهٔ فرو چیده فرهنگان بخود رشته و سنجیده آهنگان موزونی اندیشه خرده
بر بی‌ربطیِ تحریر نگیرند و عذر تنگ سرمایگان غفلت و بیدماغان عالم فرصت بپذیرند

[«گلِ رعنا» بخطِ غالب (۱۸۲۸ء) کے حصّۂ اُردو کے آخری صفحے کا عکس]

ڈھونڈے ہے پھر کسو کو مقابل میں آرزو[۹۰] سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

ایک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ[۹۱] چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

پھر دل میں ہے کو در پہ کسو کے پڑے رہیں[۹۲] سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

صفحہ ۳۴ ہی پر انتخاب غزلیاتِ اردو کے فوراً بعد فارسی نثر میں یہ پانچ سطریں ہیں:

"سلسلۂ جنبانی در دوم این رنگین چمن موسوم بہ گلِ رعنا درعرضِ مذاق زبانِ پارسی کہ صہبائے حریف افگن است و بادۂ مرد آزما۔ ازانجا کہ ہنوز این گہرہائے شاہوار را برشتۂ نمطِ حروف تہجی نکشیدہ ام و این اوراقِ پراگندہ راشیرازۂ جمعیت تدوین نبستہ ،فرہمیدہ فرہنگان بخردی پیشہ وسنجیدہ آہنگانِ موزونی اندیشہ خردہ بر بے ربطی تحریر نگیرند و عذر تنک سرمایگانِ فطرت و بے دمانانِ عالم فرصت بپذیرند۔"

یہ نثر دراصل اس "رنگین چمن موسوم بہ گلِ رعنا" کے دردوم کی "گریز" ہے۔ ان تمہیدی سطور

---

۹۰ نسخۂ حمیدیہ : مانگے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
نسخۂ شیرانی : مانگے ہے پھر کسو کو مقابل میں آرزو
متداول دیوان : چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو

۹۱ نسخۂ حمیدیہ : اِک نوبہارِ ناز کو چاہے ہے پھر نگاہ
نسخۂ شیرانی : ایک نوبہارِ ناز کو چاہے ہے پھر نگاہ
متداول دیوان : اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

۹۲ متداول دیوان : پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

کے فوراً بعد اگلے صفحے (۳۵) سے فارسی اشعار کا انتخاب شروع ہو جاتا ہے جس کا آغاز "قصیدہ در مدح اسٹرلنگ" سے ہوا ہے۔ اس تمہیدی عبارت سے ایک بڑی اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ "گلِ رعنا" کی ترتیب و تدوین کے زمانے (ستمبر ۱۸۲۸ء) تک غالب کے فارسی کلام کی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب یعنی ردیف وار تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔

"گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کے حصۂ فارسی میں قصیدہ، قطعات اور مثنوی کے اشعار کے علاوہ ستائیس متفرق غزلوں سے اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ غزلیں بلا قیدِ ترتیبِ ردیف جمع کر دی گئی ہیں۔ مثلاً پہلی غزل ردیف "ن" سے، دوسری ردیف "الف" اور آخری غزل ردیف "ر" سے لی گئی ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ:

"گلِ رعنا" میں پہلی مرتبہ فارسی کلام، مرتب شکل میں ظہور پذیر ہوا[1]۔"

مولانا امتیاز علی عرشی نے "گلِ رعنا" کے نسخۂ مالک رام کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس کے حصۂ فارسی میں تو صرف منتخب غزلیں درج کی گئی تھیں، لیکن ریختہ میں سے دو چار غزلیں لے کر باقی میں سے اچھے اچھے شعر چن لیے تھے[2]۔"

لیکن "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے، بخطِ غالب سے، اس بیان کی تائید نہیں ہوتی[3]۔ اس کے حصۂ فارسی میں صرف غزلیں ہی نہیں، قصیدے اور مثنوی کی اصناف سے بھی شعر منتخب کیے گئے ہیں۔ نیز "منتخب غزلیں" زیادہ تر پوری کی پوری ہی نقل ہوئی ہیں — اور "ریختہ میں سے دو چار غزلیں نہیں" بلکہ ایک سو سے بھی زیادہ غزلیں لی گئی ہیں۔

• فارسی اشعار کا انتخاب صفحہ ۳۵ سے شروع ہو کر صفحہ ۶۹ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۷۵

---

[1] کلیاتِ فارسی غالب، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۷ء، پیش گفت، ص ۱۔

[2] دیباچہ دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۰۔

[3] "گلِ رعنا" کا نسخۂ مالک رام شائع ہو چکا ہے (علمی مجلس، دلّی، ۱۹۷۰ء) اس سے بھی عرشی صاحب کے اس بیان کی توثیق نہیں ہوتی۔

پر ایک فارسی غزل کے آٹھ اشعار کو غالب نے چوپارہ کے سے انداز میں کچھ اس طرح رقم کیا ہے :

خوشا جانے کہ اندوہِ فروگیرد سراپایش   ز نومیدی تواں پرسید لطفِ انتظارِ ما

فروزد ہم فرو رنگِ گل از انداز تب و تابش
کبابِ بزمِ شوخی ہاست بیزاری بہارِ ما

چہ بوئے گل خروشِ ناز نہیم از بستی پیچ می پیچی
شکستن دارد از صد جا عنانِ اختیارِ ما

نشستن بر سرِ راہِ تمنا بر نمی دارد
کہ ہر کس می رود از خویش میگیرد دوچارِ ما

حریفان سوزشِ عشق ترا بے پردہ دیدند
بہار ا گر گذشت موسمِ گل پردہ دارِ ما

بسوز از مستی ذوق تو می بالد تماشائے [۴۴]
بموجِ بادہ ماند بر تو تیغِ مزارِ ما

چہ بے تمکین ہجوشی و تیز و نالہ نتواں شد
بدو بستہ خلاحن مر سر را کوہسارِ ما

خوشا آوارگی گر در نوردِ شوق بر بندد   بہ تارِ دامنے شیرازۂ مشتِ غبارِ ما [۴۵]

---

۴۴ i) دیوانِ فارسی، غالب، ۱۸۴۵ء، ص۵۴ : "چشم" بجائے : ذوق

ii) کلیاتِ غالب، فارسی، ۱۹۶۳ء، ص۲۹۵ : "چشم" بجائے : ذوق

۴۵ غزلیاتِ فارسی، غالب، مرتبہ : وزیر الحسن عابدی، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء
ص۳۲ : "مشک" بجائے : مشت

نودریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب میں بھی غالب نے طرح طرح سے ترچھے مرتعوں میں اشعار رقم کیے ہیں — "مرقعِ غالب" (پرکھوی چندر) میں بھی بخطِ غالب اِس نوع کی کتابت کی اِکا دُکا مثالیں مل جاتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے اسے غالب کی "رنگین مزاجی" سے تعبیر کیا ہے[۵۳]۔

"گُلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے (۱۸۲۸ء) میں یہ غزل بارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ غالب کے دیوانِ فارسی (۱۸۴۵ء) اور کلیاتِ غالب فارسی (۱۸۶۳ء) میں بھی اشعار کی تعداد گو یہی رہی ہے، لیکن ترتیب بدل گئی ہے۔ اخیر عمر میں نواب رامپور کی فرمائش پر غالب نے اپنے فارسی کلام کا انتخاب کیا اور ۲۴ستمبر ۱۸۶۶ء کو انھیں بھیجا۔ اس انتخاب میں اُس غزل کے صرف دو شعر آئے، ایک مطلعِ ثانی اور دوسرا یہ شعر:

فرو زد ہر قدر رنگِ گُل، افزاید تب و تابش
کبابِ آتشِ خویش است 'پنداری' بہارِ ما[۵۴]

"گُلِ رعنا" کا یہ دوسرا دور یعنی اشعارِ فارسی کا انتخاب جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے صفحہ ۶۹ پر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد "خاتمۂ گُلِ رعنا" کی دو نثری تحریریں ہیں جو صفحہ ۷۰ کی ابتدائی تین سطروں پر تمام ہوتی ہیں۔ دوسری اور آخری عرضداشت وہ ہے جو اُنھوں نے اودھ کے نائب السلطنت معتمد الدولہ سید محمد خان بہادر عرف آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔

غالب، پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں کئی ماہ ٹھہرے اس عرضداشت کے شروع میں وہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں مہربانوں کی توجہ سے میرا ذکر رفتہ رفتہ سید آغا میر کی بزم میں پہنچا جو معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے "از انجاب

---

[۵۳] نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۵۹۵

[۵۴] انتخاب غالب، امتیاز علی عرشی، بمبئی ۱۹۴۲ء، ص ۱۴

ایمای کشتۂ رفت" ملاقات کا انتظام ہُوا، اُس وقت، غالب کہتے ہیں کہ قصیدہ نہ کہا جا سکا[۸] اور صنعتِ تعطیل میں ایک مختصر فارسی نثر لکھ لی:

"طبع از فکرِ قصیدہ تشنگی کرد و سینہ بر این آرزو تنگی۔ جنونِ شوقم بہ بیداریِ نثر انداخت و سوادِ عبارتے ہم در صنعتِ تعطیل روشن ساخت۔"

"اگر چہ وقت اقتضایِ دیدن آن جاہ مند نکرد و آن ہوس از سینہ بدر رفت"

اور یہ ملاقات اس وجہ سے نہ ہو پائی کہ غالب نے ملاقات کی جو شرطیں پیش کی تھیں[۹]، وہ منظور نہ ہوئیں —— بہر نوع "گلِ رعنا" کا زیرِ نظر مخطوطہ صفحہ ۳۰۸ پر بخط غالبؔ آغا میر کے نام صنعتِ تعطیل میں فارسی نثر کی ان چار سطروں پر تمام ہوتا ہے

"طبع مرہم دار، کہ گردِ ملال[۱۰] حالِ مرا در ہم و دلِ کم حوصلہ درد مرا رُسوا در عالم کردہ احکم الحکام و صمد العلام سرور سرکردہ[۱۱] اہلِ کرم عمدۂ اُمراء مدار المہام و الاہم را عمر دوام اساس و امر عالم مطاع و حکم عدو کاہ[۱۲]

---

[۸] غالبؔ نے گو یہ کہا ہے کہ اُنھوں نے آغا میر کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا، صرف صنعتِ تعطیل میں نثر لکھ لی تھی، لیکن "نامہائے فارسی غالب" (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء) کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے ممدوح کی شان میں ایک قصیدہ کہا تھا، جس کی بعض ابیات میں آغا میر کا نام بھی آیا تھا۔

[۹] ان شرائط کے لیے دیکھیے: ذکرِ غالب، مالک رام، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۶۷

[۱۰] پنج آہنگ، طبع دوم، دہلی، اپریل ۱۸۵۳ء (= پ) : "کساد" بجائے : ملال
کلیاتِ نثر غالب، طبع اوّل، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء (= ک) "کساد" بجائے : ملال

[۱۱] پ، ک : "دارد۔ مأمول کہ سرکار والا سحر حلال و گوہر کمال مرا در سلک مطالعہ در آوردہ اصلاح حال صلہ دہد، مگر دلِ گرہ در گرہ دام مدعا گردد کہ سہا ہم طالع ماہ و مگس ہمسر ہما گردد۔"
بجائے :
ودلِ کم حوصلہ درد مرا رُسوا در عالم کردہ۔

[۱۲] ک : "سرگردہ" بجائے : سرکردہ

[۱۳] پ، ک : "مال" بجائے : کاہ

و دل آسودہ و طالع مسعود عطا دارد   مُحرّر دُعا گو مُحمد اسداللہ[۴۴]

"مُحرّر دعا گو محمد اسداللہ" کو سطر سے قدرے الگ کر کے ترچھا دستخط نما انداز میں لکھا گیا ہے۔

"گُلِ رعنا" بخطِ غالب کے زیرِ نظر قلمی نسخے کے آخر میں سرِ اسم "مُحمد" موجود ہے۔ "مُحمد" کا ٹکڑا ابتداءً غالب کا جزوِ اسم تھا، لیکن بعد میں یہ موقوف ہوا۔ ۱۸۵۸ء میں تفتہ اور آرام وغیرہ کی زیرِ نگرانی مطبع مُفیدِ خلائق، آگرہ سے غالب کی مشہور کتاب "دستنبو" شائع ہوئی[۴۵] تفتہ نے پوچھا تھا کہ سرورق پر "اسد اللہ خاں" کے بجائے "مُحمد اسداللہ خاں" کیوں نہ لکھا جائے؟ غالب، ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کو جواباً لکھتے ہیں:

> "سُنو صاحب! لفظ مُبارک میم، حا، میم، دال (محمد)، اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے، مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ، یعنی "محمد" اسداللہ خاں نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے[۴۶]۔"

"خاتمۂ گُلِ رعنا" کے فوراً بعد صفحہ ۸۲ ہی کی خالی جگہ سے شکستہ خفی قلم میں "ولہ" کا عنوان دے کر "مثنوی بادِ مُخالف" یا "آشتی نامہ" شروع ہو جاتی ہے۔ "گُلِ رعنا" میں منقول اس کی روایت، مثنوی کی مُروّجہ روایت سے مختلف ہے — صفحہ ۸۳ پر اس مثنوی کے بہ ترتیبِ ذیل یہ پندرہ شعر آئے ہیں:

---

[۴۴] ک: "ط، مُحرّر اسداللہ مُحرّرہ دوم محرم الحرام" بجائے: مُحرّر دعا گو محمد اسداللہ۔ پ، میں "مُحرّر" سے پہلے لفظ "فقط" کی مخفف صورت "ط" محذوف۔

[۴۵] "دستنبو" کے تعارف میں دیکھیے: "غالب اور انقلاب ستاون" از ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن، مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۲ء

[۴۶] اُردوئے مُعلّٰی، طبع اول: اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۵۹

["گلِ رعنا" بخطِ غالب (۱۸۲۸ء) کے خاتمے کا عکس یہاں غالب نے اپنا پورا نام "محمد اسداللہ" درج کیا ہے۔ اس کے بعد مثنوی "بادِ مخالف" شروع ہو جاتی ہے جو غالب کے خط میں نہیں]

ولہ[87]

اے تماشائیان بزمِ سخن (۱) وے مسیحادمانِ نادرفن

اے گرانمایگانِ عالمِ حرف (۲) خوش نشینانِ این بساطِ شگرف

اے سخن را طرازِ جاں دادہ (۳) صفحہ را سازِ گلستاں دادہ[88]

عطر بر مغزِ گیتی افشانان (۴) پہلوانانِ پہلوی دانان[89]

اے گرامی فنانِ ریختہ گو (۵) نغز دریاکشانِ عربدہ جو[90]

اے سخن پرورانِ کلکتہ (۶) وے بلند اخترانِ کلکتہ[91]

ہر یکے صدرِ بزمِ بارگہے (۷) شمعِ خلوت سرایِ کارگہے[92]

ہر یکے پیش تازِ قافلۂ (۸) ہر یکے کدخدایِ مرحلۂ[93]

اے بہ شغلِ وکالت آمادہ (۹) دادِ غمخواریِ جہاں دادہ[94]

اے شگرفانِ عالمِ انصاف (۱۰) بہ سفارت رسیدہ از اطراف[95]

اے رئیسانِ این سوادِ عظیم (۱۱) وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم

ہمچو من آرمیدۂ این شہر (۱۲) بہرِ کارے رسیدۂ این شہر

اسد اللہ خان ہیچدان (۱۳) جادہ پیمائے وادیِ حرمان[96]

---

[87] دیوانِ فارسی، غالب (۱۸۴۵ء)، عنوان: "پنجمین مثنوی موسوم بہ 'بادِ مخالف'"

[88] دیوانِ فارسی، ایضاً، باعتبارِ ترتیب آٹھواں شعر

[89] دیوانِ فارسی، ایضاً، نواں شعر [90] دیوانِ فارسی، دسواں شعر

[91] دیوانِ فارسی، ایضاً: تیسرا شعر، نیز مصرعۂ ثانی: "وی زبان آورانِ کلکتہ" "متفرقاتِ غالب" (طبع دوم، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۶۹ء) میں مصرعۂ ثانی کی روایت: "وی بلند اخترانِ کلکتہ"

[92] دیوانِ فارسی، غالب (۱۸۴۵ء) میں باعتبارِ ترتیب چوتھا شعر [93] دیوانِ فارسی، ایضاً: پانچواں شعر

[94] دیوانِ فارسی، ایضاً: چھٹا شعر [95] دیوانِ فارسی، ایضاً: ساتواں شعر

[96] دیوانِ فارسی، ایضاً: شعر کی شکل یہ ہے:

اسد اللہ بخت برگشتہ

در خم و پیچ غم سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ میہمان شماست (۱۴) بے سخن ریزہ چینِ خوان شماست[۹۷]

بہ تظلم رسیدہ است این جا (۱۵) بہ اُمید آرمیدہ است این جا[۹۸]

"دیوانِ غالب فارسی" (۱۸۴۵ء) میں اس مثنوی کے اشعار کی قرأت اور ترتیب "گُلِ رعنا" کے آخر میں منقول اس مثنوی سے مختلف ہے۔ دیوان میں اس مثنوی کا نظرِ ثانی شدہ متن شامل ہے۔ اس نظرِ ثانی میں اشعار کی ترتیب بدل گئی ہے۔ بعض مؤخر شعر، مقدم اور بعض مقدم شعر مؤخر ہو گئے ہیں۔ بعض اشعار میں ترمیم عمل میں آئی ہے اور کچھ اشعار حذف بھی کر دیے گئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں مسعود حسن رضوی ادیب نے "متفرقاتِ غالب" کے نام سے اپنے ذاتی کُتب خانے کی ایک قلمی بیاض سے غالبیات کے سلسلے کا کچھ نیا مواد، ترتیب و توضیح کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس میں یہ مثنوی بھی موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "یہ مثنوی غالب کے کُلیاتِ نظم میں "بادِ مخالف" کے نام سے شامل ہے مگر اس میں کہیں کہیں لفظی ترمیم کر دی گئی ہے۔ کہیں کوئی شعر، کہیں کئی شعر گھٹا یا بڑھا دیے گئے ہیں اور کہیں شعروں کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ . . . اس بیاض میں اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتے والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی۔[۹۹]"

"متفرقاتِ غالب" میں شامل "بادِ مخالف" کا متن "گُلِ رعنا" کے آخر میں منقول، اس مثنوی کی قرأت اور ترتیب سے تمام کا تمام تو نہیں، لیکن بڑی حد تک ملتا ہے۔ مثنوی مذکور کی وہ روایت بھی معمولی فرق سے قطع نظر، ان اشعار کی قرأت اور ترتیب سے کم و بیش مطابقت رکھتی ہے جیسے حکیم حبیب الرحمٰن خاں مرحوم (ڈھاکا) کے ذخیرۂ کُتب

۹۷؎ "متفرقاتِ غالب" (طبعِ دوم، ۱۹۶۹ء) میں باعتبارِ ترتیب سولھواں شعر

۹۸؎ متفرقاتِ غالب، ایضاً: چودھواں شعر ۹۹؎ متفرقاتِ غالب، طبعِ دوم، ۱۹۶۹ء، ص ۲۳

میں محفوظ، غالب کے ایک فارسی مجموعے سے نقل کر کے قاضی عبدالودود نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن مسلینی، جلد ۱، بابت ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا۔

اس مثنوی کا ایک متن سید اکبر علی ترمذی کی مرتبہ : "نامہائے فارسی غالب" [۲۲] میں بھی شائع ہوا ہے جو کچھ اختلاف کے ساتھ وہی ہے جو غالب کے "دیوانِ فارسی" میں ہے۔ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ "گُلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کے آخر میں "بادِ مخالف" کی جو شکل ضبطِ تحریر میں آئی ہے، دراصل یہ، اُس صورت میں ہے جس صورت میں یہ اوّل اوّل سخنورانِ کلکتہ کے سامنے پیش کی گئی تھی۔

غالبیات میں "گُلِ رعنا" کی بڑی اہمیت ہے، نودریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب (۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء) کے بعد یہ واحد مجموعہ ہے جو پُورے کا پُورا غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس سے غالب کے اندازِ نگارش اور طرزِ املا کے بارے میں بہت سی باتیں نظر کے سامنے آتی ہیں۔ غالب کے اُردو اور فارسی کلام کی تاریخی ترتیب اور فنی ارتقا کے منازل و مراحل کے تعین میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

"گُلِ رعنا" کا یہ مخطوطہ نودریافت دیوان (۱۸۱۶ء) نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے بعد اشعارِ غالب کا قدیم ترین متن پیش کرتا ہے۔ یہ اب سے قریب ڈیڑھ سو برس پہلے کا لکھا ہوا ہے اور خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس لیے اختلافِ نسخ ظاہر کرنے کے لیے بھی اس کی بڑی بنیادی اہمیت ہے۔

"گُلِ رعنا" (غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ/ ۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء) میں کچھ ایسا اُردو کلام بھی شامل ہے جو "نسخۂ شیرانی" (۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) میں موجود نہیں۔ — یہ گویا ۱۲۴۲ ہجری اور ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری کی درمیانی مدّت میں لکھا گیا ہے۔ غالب کے فارسی کلام کی پہلی تاریخی حدبندی کرنے میں بھی "گُلِ رعنا" کو بڑی بُنیادی حیثیت اور اہمیت حاصل ہے۔

---

[۲۲] نامہائے فارسی غالب، مرتبہ: سید اکبر علی ترمذی، غالب اکیڈمی، دہلی ۱۹۶۹ء

اب، اُن تیرہ فارسی رباعیوں کے علاوہ جو نَودریافت دیوانِ غالب (۱۸۱۶ء) میں شامل ہیں اور اُس فارسی قصیدے کو چھوڑ کر جو "نسخۂ حمیدیہ" (۱۸۲۱ء) میں فاتحۃ الکتاب کے طور پر شامل ہے[۱۱]، غالب کے فارسی کلام کی پہلی تاریخی حد بندی "گُلِ رعنا" ہی کی بنیاد پر ہو گی۔ اس مخطوطے سے اُردو اور فارسی کے تقریباً نو سو اشعار اور چند فارسی نثروں کی تصحیح بھی ہوتی ہے اور بعض اہم اختلافات کا پہلی بار علم ہوتا ہے۔ میں اس نادر نسخے کی شایانِ شان اشاعت کی فکر میں ہوں[۱۲]

---

[۱۱] قصیدہ: بہر ترویج جناب والی یوم الحساب" تعداد اشعار: ۶۰

[۱۲] "گُلِ رعنا، بخطِ غالب" کے تعارف میں یہ زیرِ نظر مقالہ لکھا جا چکا تھا کہ اپریل ۱۹۷۵ء میں ہندوستان سے ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی "غالب ببلیوگرافی" کا قیمتی تحفہ موصول ہوا جس سے ہندوستان میں چھپے ہوئے کچھ ایسے مقالات و مراسلات کے حوالے میرے احاطۂ علم میں آئے جو براہِ راست یا بالواسطہ "گُلِ رعنا" سے متعلق ہیں لیکن میری نظر سے نہیں گزرے۔

"گُلِ رعنا"

مطبوعہ، لاہور (عابدی) کی حقیقت

"گلِ رعنا" غالب کے اُردو اور فارسی کلام کا اوّلین انتخاب ہے، جسے خود غالب نے ۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء کو بمقام کلکتہ، اپنے ایک عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر مرتب کیا تھا[1]۔ "گلِ رعنا" کو غالب کی زندگی میں روزِ اشاعت نصیب نہیں ہوا، اُن کی وفات کے بعد بھی اسے اشاعت کا منہ دیکھنے میں سو برس لگ گئے۔ غالب صدی سے قریب یہ انتخاب بتفصیلِ ذیل، سیّد وزیر الحسن عابدی کی توجہات سے منظرِ عام پر آیا:

تصحیح و تحقیق: سیّد وزیر الحسن عابدی

ناشر: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور

زمانۂ طباعت: دسمبر ۱۹۶۹ء تا دسمبر ۱۹۷۰ء

ضخامت: ۳۵۶ صفحات، سائز ۲۰×۲۶/۸

یہ کتاب خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ کتابیاتی جزئیات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ پیش لفظ، از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ستارۂ پاکستان — صفحہ ۳

۲۔ مقدمہ، از مرتب: سیّد وزیر الحسن عابدی (۶۶ صفحات) — صفحہ ۱۵-۸۱

---

[1] اشاریۂ غالب، سیّد معین الرحمٰن، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۱

۳- متن "گل رعنا" از : غالب (۱۲۰ صفحات)

کتاب کے آخری نو صفحات (۲۶۸ - ۲۷۶) "غلط نامہ" پر مبنی ہیں۔ اس میں (صفحہ ۲۶۸ - ۲۷۲) مقدمے، متن اور تعلیقات کی ایک سو سے خاصی زیادہ اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے۔ "تصحیح مزید" (صفحہ ۲۷۳ - ۲۷۶) کے تحت مقدمے، متن اور تعلیقات کی مزید ایک سو سے زیادہ غلطیاں درست کی گئی ہیں۔ "توضیح" (صفحہ ۲۷۶) کے زیرِ عنوان کتاب کے مرتب سید وزیر الحسن عابدی نے بتایا ہے کہ "گل رعنا" کے اصل متن کے اردو اشعار میں راہ پا جانے والی غلطیاں ان کے علاوہ ہیں جن کی تصحیح بنیادی طور پر تعلیقات میں کی گئی ہے۔ نیز مقدمے اور تعلیقات کی دو معمولی اغلاط بھی ان کے علاوہ ہیں جن کی نشان دہی غلط نامے میں نہیں کی گئی اور جنہیں عام قاری کے ذوقِ سلیم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کتاب پر تاریخ طباعت دسمبر ۱۹۶۹ء درج ہے لیکن اصلاً کتاب ۱۹۷۰ء کے آخر میں شائع ہو کر اہلِ ذوق

کے ہاتھوں میں آئی۔ اس درمیانی وقفے میں "غلط نامہ" ترتیب پاتا رہا۔

"بوئے گل" کے ایک ذیلی عنوان کے تحت سید وزیرالحسن عابدی، مقدمے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۵۲ء میں راقم کو . . . . غالب کے دست نوشتہ نسخے کے مالک، محب مکرم جناب خواجہ محمد حسین صاحب کی عنایت سے "گل رعنا" کی چند لمحے خوشبو سونگھنی نصیب ہوئی اور پھر پیہم آرزو اور کئی دفعہ کی سعی و کوشش کے باوجود پورے سولہ برس بعد خواجہ صاحب موصوف کے دولت کدے پر دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک مبارک شب میں اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے اور غور سے پڑھنے کا موقع ملا جس میں محترم خواجہ صاحب کی عنایت و نوازش شامل، لیکن سخن وانی دگفتگوئے[۱] اور مہمان نوازی حائل رہی۔" (مقدمہ، صفحہ ۱۷)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فاضل مرتب سید وزیرالحسن عابدی کا یہ "مقدمہ" صریحاً مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے۔

مجھے غالب کے دست نوشتہ نسخہ "گل رعنا" کی زیارت کا متعدد بار موقع ملا ہے۔ اس نادر نسخے سے استفادہ کرنے اور غالب کے دوستوں سے اس کا تعارف کرانے کی عزت اور سعادت بھی اوّل اوّل راقم الحروف ہی کو حاصل ہوئی[۲]۔ مجھے خواجہ صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ موصوف کا نام خواجہ محمد حسن[۳] ہے، نہ کہ خواجہ "محمد حسین" عابدی صاحب نے

---

[۱] اس وقت "گل رعنا" (عابدی) صاحب کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اُس میں یہاں بین السطور لفظ "گفتگو" خود عابدی صاحب نے اپنے قلم سے بڑھایا ہے۔

[۲] (الف) اشاریۂ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء ص ۳۹۹-۴۰۸

(ب) نسخۂ گل رعنا (بخطِ غالب) از: سید معین الرحمٰن، نقوش، لاہور، غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۵-۲۳۳

[۳] خواجہ صاحب کے حالات کے لیے: اشاریۂ غالب، ایضاً، ص ۴۰۴

خواجہ صاحب کو اپنا "محبِ مکرم" بتایا ہے لیکن وہ اُن کے صحیح نام تک سے ناآشنا ہیں۔

خواجہ محمد حسن صاحب کے مملوکہ نسخۂ "گلِ رعنا" کے متن سے عابدی صاحب کی آشنائی اور اُس کے مشمولات و مندرجات تک اُن کی رسائی، دراصل ایک بے بُنیاد افسانے سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید وزیر الحسن عابدی کے مرتّبہ متن کی کوئی مُحکم بنیاد نہیں ہے۔ یہ اُن کے دعوے کے برعکس نسخۂ خواجہ محمد حسن پر مبنی نہیں ہے، اس لیے "گلِ رعنا" کے اس متن کو نوشتۂ غالب سمجھ کر اس سے استفادہ کرنا گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۲ء میں "غالب کے اس دست نوشت نسخے کی چند لمحے خوشبو سونگھنے" والی بات کچھ تفصیل چاہتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ بات ۱۹۵۲ء کی نہیں بلکہ جیسا کہ خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا غالباً ۱۹۵۶ء کی ہے۔ خواجہ محمد حسن صاحب کو پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ "گلِ رعنا" کا یہ نسخہ غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا نہیں۔ انھوں نے اپنے ایک عزیز کے توسط سے عابدی صاحب کو "گلِ رعنا" کا یہ نسخہ دکھا کر ان کی رائے چاہی۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ عابدی صاحب نے اس نسخے کو ذرا کی ذرا ہاتھ میں لیا، آنکھ کے قریب لے گئے، اور پھر اُسے میز پر ایسی بے نیازی سے ڈال دیا کہ مجھے اُن کا مخطوطے کو اس طرح پٹکنا پھینک دینے کے عمل سے قریب تر معلوم ہوا، اور پھر مجھ سے کچھ یوں گویا ہوئے:

> "جی نہیں! یہ قطعاً نوشتۂ غالب نہیں ہے۔ غالب کی تحریر کو تو میں ایک فرسنگ سے بھی پہچان لوں اور اُڑ کر اُس تک پہنچوں۔"

خواجہ محمد حسن صاحب، ایک ماہرِ غالبیات کی اس تشخیص سے اس قدر شکستہ خاطر ہوئے کہ پھر کبھی اس بارے میں اہلِ علم سے رجوع نہیں کیا اور یوں بھی اس مدت میں وہ کاروباری مصروفیات میں ایسے اُلجھے رہے کہ برسوں اُنھیں مخطوطے کا خیال تک نہیں آیا۔

دوسری طرف خود سید وزیر الحسن عابدی صاحب نے مجھ سے زبانی گفتگو میں اعتراف

کیا کہ اس نفسیاتی طریقِ عمل سے انھوں نے اس نسخے کو بے دام حاصل کرنے کی فکر کی تھی۔
بر بنائے تجاہل، مالکِ مخطوطہ کا اتا پتا بھی نہ لیا۔ خیال تھا کہ یہ صاحب پھر میرے پاس
آئیں گے اور کسی اگلی ملاقات میں اونے پونے، میں اس مخطوطے کا اُن سے سودا کر لوں گا۔
اس واقعے کے کچھ ہی عرصے کے بعد سُنا گیا کہ دلی میں جناب مالک رام کو "گل رعنا" کا کوئی قلمی
نسخہ ملا ہے، میں نے سمجھ لیا کہ یہ وہی نسخہ ہوگا جو مجھے دکھایا گیا تھا ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اب کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ناچار صبر کرکے بیٹھ رہا۔ اسی لیے مالکِ
مخطوطہ کی تلاش یا اُن سے ملاقات کی نہ کوشش کی، نہ کوئی سبیل ہی نکلی تا آنکہ :

"خواجہ صاحب موصوف کے دولت کدے پر دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک مبارک شب
میں اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے اور غور سے پڑھنے کا موقع ملا جس
میں محترم خواجہ صاحب کی عنایت و نوازش شامل، لیکن دسترخوانی گفتگو اور
مہمان نوازی حائل رہی۔"

[سید وزیر الحسن عابدی، مقدمہ، صفحہ ۱۷]

خواجہ صاحب فرماتے ہیں: کہ اس ملاقات میں انھوں نے لمبی چوڑی تمہید باندھی،
کچھ دبے کچھ کھلے لفظوں میں غالب سے اپنے عشق کا ذکر کیا اور ضمناً نسخۂ "گل رعنا" کو
دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے نسخہ نکلوایا۔ عابدی صاحب نے دست بستہ کھڑے ہو کر اسے
مجھ سے لیا، چوما، آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا اور میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اس نسخے
کو قوم کے گراں بہا ترین تہذیبی سرمایے سے تعبیر کرتے ہوئے، اس قیمتی موتی کے امین ہونے
کی بنا پر مجھے معاشرے کا فردِ کبیر ٹھہرایا اور دیر تک بلا تکان تملق اور مبالغے کی اس
طرح پیہم گفتگو کرتے رہے کہ مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں نے اُنھیں بتایا
اور یاد دلانا چاہا کہ وہ اس نسخے کو پہلے سرسری طور پر دیکھ کر رد کر چکے ہیں، لیکن انھوں نے

اس سے انکار کر دیا اور یہ بھی تسلیم نہیں کیا کہ اس سے پہلے کبھی ان سے ملاقات بھی ہوئی ہے۔

بہر حال اس شب عابدی صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے کے قریب میرے پاس بیٹھے اور اصل مخطوطے کی ایک نقل جو میں نے ایک زمانے میں اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی، امانۃً رات بھر کے لئے لے گئے اور واقعی اگلے روز علی الصبح انھوں نے میری دست نوشتہ نقل مجھے لوٹا دی۔ میرے استفسار پر خواجہ محمد حسن صاحب نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل مخطوطے سے جو نقل انھوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کی ہے، اس پر خود انھیں بھروسہ نہیں تھا، اس لیے کہ غالب کا سوادِ تحریر، اُن کے لیے مانوس نہیں۔ پھر کسی مخطوطے کو پڑھنا یوں بھی ایک خاص طرح کی تربیت چاہتا ہے جس کا انھیں کوئی دعویٰ نہیں، پھر اپنی غیر معمولی لیکن غیر علمی کاروباری مصروفیات کے باعث غالبیات یا بحیثیت مجموعی مطالعۂ ادب وغیرہ کی بھی انھیں کبھی باقاعدہ فرصت میسر نہیں آئی۔

مختصر یہ کہ نسخۂ "گل رعنا" بخطِ غالب، مملوکہ خواجہ محمد حسن صاحب تک عابدی صاحب کی رسائی اور اس سے استفادے کی کل حقیقت اور اصلیت بس اتنی ہے۔ اس پس منظر میں، اب عابدی صاحب کا بیان لطف سے خالی نہ ہوگا، مقدمے میں فرماتے ہیں:

> "خواجہ صاحب موصوف کے دولت کدے پر دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک مبارک شب میں اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے اور غور سے پڑھنے کا موقع ملا، جس میں محترم خواجہ صاحب کی عنایت شامل لیکن دسترخوانی گفتگو اور مہمان نوازی حائل رہی۔ چونکہ اس سے پہلے راقم کو خاندانِ شریفی کی جلیل القدر اور جمیل الشیم شخصیت نبیرۂ حکیم اجمل خان اعظم محب مکرم جناب حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا کے ذاتی کتب خانے میں موصوف کے لطفِ خاص سے "گل رعنا" کے اس نسخے کی نقل لے لینے کا موقع ملا تھا جو غالب کے ایک معاصر عزت اللہ دہلوی نے خود مصنف کے نسخے سے تیار کی تھی اور اس سے

بھی بہت پہلے اس نسخے کے بارے میں جو مالک رام صاحب کو بھارت میں ۱۹۵۰ء
میں اُن کے ایک دوست کی طرف سے تحفتہً ملا تھا، موصوف کے دو مقالے میری
نظر سے گزر چکے تھے، اس لیے خواجہ صاحب کے نسخے میں ضروری مقامات کو
میں نے جلد دیکھ لیا، لیکن مزید مطالعے کے لیے خواجہ صاحب نے اپنے ہاتھ
کی لکھی ہوئی ایک نقل بھی چند دن کے لیے مجھے دی جس سے استفادے کے
لیے موصوف کا ممنون اور سپاس گزار ہوں۔"

[مقدمہ: صفحہ ۱۷ و بعد]

اس بیان کو درج ذیل صراحتوں کی روشنی میں دیکھنا مفید ہوگا:

۱۔ کیوں کر باور کر لیا جائے کہ دسمبر ۱۹۶۸ء کی محض ایک مبارک شب کے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں عابدی صاحب کو اس گراں بہا مخطوطے کو "جی بھر کر دیکھنے کا موقع مل گیا" جبکہ خود ہی فرماتے ہیں کہ اس مختصر سی نشست میں "خواجہ صاحب کی دستر خوانی گفتگو اور مہمان نوازی حائل رہی۔"

۲۔ عابدی صاحب کا بیان ہے کہ دسمبر ۱۹۶۸ء سے پہلے اُنھیں غالب کے معاصر عزت اللہ دہلوی کے مکتوبہ اس نسخے کی نقل لینے کا موقع مل چکا تھا جسے عزت اللہ نے خود غالب کے نسخے سے تیار کیا تھا[۵]۔

۳۔ اور دسمبر ۱۹۶۸ء سے بھی "بہت پہلے" عابدی صاحب کا بیان ہے کہ "گل رعنا کے بارے

---

۵ عزت اللہ دہلوی کی مکتوبہ "گل رعنا" کی نقل کے بارے میں عابدی صاحب نے سرسری ایک بات کہہ دی ہے کہ یہ نقل کاتب نے مصنف (یعنی غالب) کے نسخے سے تیار کی تھی۔ کس بنیاد پر انھوں نے یہ رائے قائم کی، اس بارے میں ۶۶ صفحات پر مشتمل اپنے مقدمے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا اور ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی جس سے اُن کے اس بیان کی تصدیق ہوتی۔ خود کاتب کے حالاتِ زندگی معروف ہیں یا نامعلوم، اس پر بھی کچھ روشنی نہیں ڈالی گئی۔

میں مالک رام صاحب کے دو مقالے ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ جب کہ "گل رعنا" کے بارے میں مالک رام صاحب کے دو مقالوں میں سے ایک تو پہلی بار چھپا ہی "نذرِ ذاکر" میں ہے اور یہ مجموعۂ مقالات (مطبوعہ: دہلی) ۱۹۶۸ء کے آخر تک شائع بھی نہیں ہوا تھا۔ مالک رام دسمبر ۱۹۶۸ء میں لکھتے ہیں کہ:

"گل رعنا"... سے متعلق میں دو مفصل مضمون لکھ چکا ہوں۔ اُردو حصے والا مضمون ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ "نذرِ ذاکر" میں شامل ہے"۔

[فروغِ اُردو، لکھنؤ، غالب نمبر، دسمبر ۱۹۶۸ء، حصہ ۱، صفحہ ۲۰]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ عابدی صاحب کو دسمبر ۱۹۶۸ء سے پہلے نسخۂ عزت اللہ کی نقل مل چکی تھی اور "اس سے بھی بہت پہلے" انھوں نے "نذرِ ذاکر" کا مطالعہ کر لیا تھا حالانکہ اس وقت تک یہ کتاب حلیۂ طبع سے آراستہ بھی نہ ہوئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ عابدی صاحب کو ۱۹۶۹ء کے اوائل تک اتفاق سے "گل رعنا" کے اُردو حصے کے تعارفی مقالے (از مالک رام) کی اشاعت کے حوالے سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ یہاں میرے لیے ایک نجی حوالہ بھرنا گزیر ہو گیا ہے۔ غالب صدی کا چرچا شروع ہو چکا تھا اور میں "اشاریۂ غالب" کی ترتیب و تسوید میں مصروف تھا کہ عابدی صاحب نے یاد فرمایا اور یہ پیغام بھیجا کہ:

"غالب کے مشارٌ الیہ "گل رعنا" کے حصّۂ اُردو پر مالک رام کے مضمون کے سلسلے میں رہنمائی فرمائیں"۔

میں عابدی صاحب سے ملا[۱] اور "نذرِ ذاکر" کی نشان دہی کی کہ مالک رام صاحب کی کتاب

---

[۱] اس ملاقات میں عابدی صاحب نے از رہِ لطف "باغِ دودر" کا اپنا مرتبہ نسخہ تقدیمی کلمات کے ساتھ مجھے عنایت فرمایا۔ عابدی صاحب کا یہ دستخطی نسخہ میرے ذخیرۂ غالبیات میں محفوظ ہے۔ اس پر ۸۔ جنوری ۱۹۶۹ء کی تاریخ ثبت ہے۔

"ذکرِ غالب" طبعِ چہارم، صفحہ ۲۰۳ کے ایک ذیلی حاشیے میں "نقدِ ذاکر" کا حوالہ آ چکا تھا۔ دراصل عابدی صاحب نے یہ سب کچھ اس لیے لکھا ہے کہ "مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے"، "ذرا سی مہلت میں "بغور پڑھ لینے" اور "ضروری مقامات دیکھ لینے" اور ان سے نتائج اخذ کر لینے کے لیے "ایک مُبارک شب کی چند غیر یکسیا ساعتوں" کا کافی جواز پیدا ہو سکے۔

سید وزیر الحسن عابدی کا یہ کہنا بھی صریحاً خلافِ واقعہ ہے کہ:

"مزید مطالعے کے لیے خواجہ صاحب نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک نقل بھی چند دن کے لیے مجھے دی" (مقدمہ: ص ۱۸)

واقعہ یہ ہے کہ "چند دن" نہیں بلکہ اس "مبارک شب" کے بقیہ چند گھنٹوں کے لیے وہ اس نقل کو امانتاً خواجہ صاحب سے لے گئے تھے اور اس عرصے میں اس سے جیسا کچھ "استفادہ" وہ کر سکے ہوں گے، کر کے علی الصبح یہ نقل، وہ خواجہ محمد حسن صاحب کو لوٹا گئے۔

سید وزیر الحسن صاحب نے "عکسِ گل" کے تحت صفحہ ۲۰ اور ۲۱ کے درمیان چار صفحات میں "گل رعنا" مکتوبہ عزت اللہ دہلوی کے چھ صفحات کے عکس (صفحہ ا، ب) اور "گل رعنا" بخطِ غالب کے دو صفحات کے عکس (صفحہ ج، د) شائع کیے ہیں۔ اور یہ بہت اچھا ہوا کہ اس بنا پر اس امر کا دستاویزی ثبوت فراہم کرنا مشکل نہیں رہ گیا کہ عابدی صاحب کا پیش کردہ "گل رعنا" کا متن نہ تو بخطِ غالب پر مبنی ہے، نہ نسخہ سویدا ہی کے مطابق ہے۔

صفحہ ۲۰ اور ۲۱ کے درمیان صفحہ ج پر دیباچۂ "گل رعنا" بخطِ غالب کے آخری صفحے کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ یہ عکس راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" سے ماخوذ ہے[ۂ]۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ عابدی صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس عکس کو "اشاریۂ غالب" سے لیا ہے بلکہ اس عکس کے اسی بلاک کو اپنی مرتبہ کتاب "گل رعنا" میں استعمال کیا ہے جس

ۂ دیکھیے: اشاریۂ غالب، از: سید معین الرحمٰن، ناشر: پنجاب یونیورسٹی، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۴۰۳

بلاک سے یہ عکس "اشاریۂ غالب" میں چھپا تھا[۸]۔ پھر کتنی عبرت کی بات یہ ہے کہ عابدی صاحب نے اس عکس کے اصل ماخذ یعنی "اشاریۂ غالب" کا حوالہ دیے بغیر اپنی کتاب میں استعمال تو کر لیا لیکن اپنے مرتبہ متن کو وہ اس صفحے کی حد تک بھی اصل کے مطابق پیش نہیں کر سکے۔

ذیل میں محولہ بالا عکس کا متن پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عبارت سید وزیر الحسن عابدی کی مرتبہ "گلِ رعنا" کے صفحہ سات کی سطر دس کے آخری لفظ سے شروع ہو کر صفحہ آٹھ پر پوری ہوئی ہے۔ اغلاط و اختلافِ نسخ کو ذیلی حواشی میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے دیباچۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے آخری صفحے کا متن مطابقِ عکسِ اصل :

دائرۂ[۹] ہر حرف سر از حلقۂ دامے برمے آرد و کلکم از عجز تحریر در کسوتِ ہر نقطہ پشت دستے بر زمین میگزارد[۱۰] اما[۱۱] خون گرمی انداز مهر بانیش را نازم کہ آتش

---

[۸] یہ اس طرح اور اس وجہ سے ممکن ہوا کہ اتفاق سے راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" اور سید وزیر الحسن عابدی کی مرتبہ "گلِ رعنا" لاہور کے ایک ہی مطبع میں چھپی ہیں۔ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے چار صفحات کے عکس میں نے "اشاریۂ غالب" میں اشاعت کے لیے مطبع کے سپرد کیے تھے۔ مطبع نے اس کے جو بلاک تیار کرائے، عابدی صاحب نے انھیں سے "فائدہ" اُٹھایا اور مطبع کے مہتمم صاحب کی عنایت لے جا سے چار میں سے دو کے عکس اپنی مرتبہ کتاب "گلِ رعنا" میں شامل کر لیے تاکہ یہ تأثر دیا جا سکے کہ اپنی "تصحیح و تحقیق" سے انھوں نے جو متن پیش کیا ہے وہ نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب پر مبنی ہے۔

[۹] عابدی صاحب کے مرتبہ دیباچۂ "گلِ رعنا" کے متن (ص ۷) میں "بہ" بجائے : بر
پنج آہنگ، طبع دوم، دہلی، اپریل ۱۸۵۳ء (= پ) میں بھی "بہ" بجائے : بر
کلیاتِ نثرِ غالب، طبع اوّل، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء (= ک) میں بھی "بہ" بجائے : بر
مطبوعہ عکس "گلِ رعنا" مکتوبہ قاضی عزت اللہ دہلوی (نسخۂ سودا) (= س) میں مطابق اصل "بر" ہی ہے۔

[۱۰] غالب ذال معجمہ فارسی کے قائل نہیں تھے۔ "میگزارد" کا املا غالب نے "ز" سے کیا ہے۔ عابدی صاحب نے اسے "ذ" سے لکھا ہے اور حاشیے یا تعلیقات میں اس کی کوئی صراحت بھی نہیں کی۔ نسخۂ سودا (= س) کے عکس میں اس کا املا "ز" ہی سے دکھائی دے رہا ہے۔

[۱۱] عابدی صاحب کے ہاں "اما" ندارد، پ اور ک میں بھی یہی صورت ہے، س میں "اما" موجود۔

افسردۂ مرا شعلہ درساخت وخاک زمین گیر مرا علم رعنائی غبار ارزانی داشت فرمان دادہ است کہ منتخبہ از دیوانِ ریختہ و غزلے چند از پارسی دریک سفینہ باہم درآمیزم و این پردۂ دو رنگ بہ پیش طاق بینش نظارگیان یک رنگ آویزم از وے بزبان گفتنی و از من بجان نیز رفتنی[12] بر دل سخن پذیر[13] سخن دلپذیر[14] جری دیدہ وران دانشمند نہفتہ مماناد[15] کہ چون در آغاز خار خار جگر کاوی شوقم ہمہ صرف نگارش اشعار اُردو زبان بود درمسلک[16] این تحریر نیز[17] ہمان جادہ گزاردہ[18] آمد[19] و ہمان را سپردہ شد کہ مباد سررشتہ از کف رود و کار از پیکار افتد ہر آئینہ این چمنستان را دو در روبرو[20] ہم کشیدم و[21] نخستین در را بہ اشعار ہندی گوہر آمودم دردوم[22] چون آغوشِ شوق

۱۲-۱۳-۱۴ "نیز رفتنی، سخن پذیر" اور "دلپذیر" کا املا غالب کے برعکس عابدی صاحب کے ہاں "ز" کے بجائے "ذ" سے کیا گیا ہے۔

۱۵ عابدی صاحب نے "تصحیح و تحقیق" کے بعد جو متن پیش کیا ہے، اس میں (ص ۸) "مباد" بجائے: مماناد، س میں مطابقِ اصل: "مماناد"۔

۱۶ بہ تصحیح و تحقیقِ عابدی جو متن مرتب ہوا ہے، اُس کے مطابق "سالک" بجائے: مسلک

۱۷ عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں "ہم" بجائے: نیز، عابدی صاحب کی اس قرأت کی تائید پ اور ک سے نہیں ہوتی۔

۱۸ بخطِ غالب کے برعکس عابدی صاحب نے بلا صراحت "گزاردہ" کا املا "ز" کے بجائے "ذ" سے کیا ہے۔

۱۹ عابدی صاحب کے متن میں "آمد" محذوف۔ پ اور ک میں بھی یہی معاملہ ہے۔ س میں "آمد" موجود۔

۲۰ عابدی صاحب کے ہاں "رو" ندارد۔ پ اور ک میں بھی یہی صورت ہے۔ س میں "رو" موجود۔

۲۱ عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں "و" محذوف۔ پ اور ک میں بھی "و" محذوف، س میں "و" موجود۔

۲۲ عابدی صاحب کے متن میں "دومین در" بجائے: دردوم۔ پ اور ک میں "دومین در" بجائے: دردوم، جبکہ س میں مطابقِ اصل: "دردوم" ہی ضبط میں آیا ہے۔

بروے پارسیان داشت و نام ایں سفینہ بزبان اداشناسان گل رعنا۔ الٰہی
ایں گل رعنا را بگوشہ دستاریہ قبول[23] جا دہے و ہر کہ ایں راگرامی نہد سپاسے
از دے برمن نہی، اشتدبس[24] و ماسوی ہوس۔ محررہ غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری[25]۔ فقط

اب لیجیے دوسرے عکس کی بات — عابدی صاحب کے "مقدمۂ گل رعنا" کے صفحہ ۲۱ سے اوّل متصل صفحہ "د" کے تحت خاتمہ "گل رعنا" کے آخری صفحے بخطِ غالب کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ یہ عکس بھی راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" سے ماخوذ و منقول ہے (دیکھیے: اشاریہ غالب، ص ۳۰۹)۔ اس عکس کے بھی اسی بلاک کو عابدی صاحب نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے، جس بلاک سے یہ عکس "اشاریۂ غالب" میں چھپا تھا اور فاضل مرتب، اس صفحے کی حد تک بھی اپنے متن کو بمطابق اصل و عکس پیش نہیں کر سکے۔ ذیل میں اس محولہ بالا عکس سے خاتمۂ "گل رعنا" کی اصل عبارت درج کی جاتی ہے۔ عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں خاتمۂ "گل رعنا" کی اس عبارت کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، اسے ذیل حواشی میں ظاہر کیا جا رہا ہے:

طبع مرتہم دارد کہ گردِ ملال[26] حال مرا درہم و[27] دلِ کم حوصلہ دو مرا دسواد عالم
گردہ احکم الحکام وصمد العلام سر و سرکردہ[28] اہل کرم عمدۂ امرا، مدار المہام

---

[23] عابدی صاحب کے متن میں "قبول" ندارد، س میں اصل کے مطابق "قبول" موجود۔
[24] عابدی صاحب کے متن میں "و" محذوف، س میں موجود۔
[25] عابدی صاحب کے ہاں لفظ "ہجری" کے بعد "فقط" کی مخفف صورت "لا" محذوف۔ عابدی صاحب نے حاشیے یا تعلیقات میں بھی اس کی صراحت یا نشاندہی نہیں کی۔
[26] عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۲۰) میں "کسالت" بجائے: ملال، پ اور ک میں بھی یہی صورت۔
[27] عابدی کے مرتبہ متن نیز پ اور ک میں: "وا دو۔ ما مول کہ سرکار دولا سبحِ ملال و گوہر کمال مرا در سلک مطالعہ درآوردہ اصلاحِ حال مسلہ دہد۔ مگر دل گرہ در گرہ دام مدعا گردد کہ شہا ہم طایع ما دیگس ہمبر ہما گردد" بجائے: ودلِ کم حوصلہ، دو مرا دسواد در عالم کردہ۔
[28] عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں "سرگروہ" بجائے: سرکردہ، ک میں بھی یہی صورت۔

والا ہم را عمر دوام اساس وامر عالم مطاع وحکم عدو کاہ[29] ودل آسودہ و
طالع مسعود عطا وارد۔ محرر دعاگو محمد اسد اللہ[30]

خاتمۂ "گل رعنا" بخطِ غالب کے آخری صفحے کے عکس میں دیکھا جاسکتا ہے کہ خاتمے کی چار سطروں کے بعد، سطر سے قدرے ہٹ کر ترچھا، دستخط نما انداز میں غالب نے: "محرر دعاگو محمد اسد اللہ" لکھا ہے اور اس سے ذرا نیچے دائیں طرف "ولہ" کا عنوان قائم کرکے "مثنوی بادِ مخالف" یا "آشتی نامہ" شروع ہو جاتی ہے۔ عکس میں اس مثنوی کے بہ ترتیب ذیل یہ پندرہ شعر آئے ہیں:

			[31]
اے تماشائیانِ بزمِ سخن	۱	دے مسیحا دمانِ نادر فن	۱
اے گران مایگانِ عالمِ حرف	۲	خوش نشینانِ ایں بساطِ شگرف	۲
اے سخن را طرازِ جان دادہ	۳	صفحہ را سازِ گلستان دادہ	۸
عطر بر مغزِ گیتی افشانان	۴	پہلوانانِ پہلوی دانان	۹
اے گرامی فنانِ ریختہ گو	۵	نغز دریا کشانِ عربدہ جو	۱۰
اے سخن پرورانِ کلکتہ	۶	دے بلند اخترانِ کلکتہ[32]	۳
ہر یکے صدرِ بزم بار گہے	۷	شمعِ خلوت سرایِ کارگہے	۴

---

[29] عابدی صاحب کے ہاں "مال" بجائے: کاہ؛ پ اور ک میں بھی یہی صورت۔

[30] عابدی صاحب کے ہاں "محرر دعاگو محمد اسد اللہ" کے بجائے: ط؛ محرر محمد اسد اللہ محررۂ دوم محرم الحرام (۱۲۴۳ھ)
پ اور ک میں سرِ اسم "محمد" محذوف۔ عابدی صاحب کے ہاں بھی متن (ص ۱۲۸) میں "محمد" موجود نہیں ہے لیکن "غلط نامے" کے تحت (ص ۱۷۲) عابدی صاحب نے سرِ اسم "محمد" کا اضافہ کرا دیا ہے۔ سنہ ہجری اضافۂ عابدی ہے۔ پ میں "محرر" سے پہلے "فقط" کی مخفف شکل "ط" ندارد۔

[31] مطبوعہ "گل رعنا" (عابدی) میں اشعار کی ترتیب یہ ہے۔

[32] مطبوعہ "گل رعنا" (عابدی) میں مصرعۂ ثانی کی شکل: دے زبان آورانِ کلکتہ

ہر یکے پیش تاز قافلۂ	۸	ہر یکے کد خدای مرحلۂ	۵
اے بہ شغلِ وکالت آمادہ	۹	داد و غم خواریِ جہاں دادہ	۶
اے شگرفانِ عالمِ انصاف	۱۰	بہ سفارت رسیدہ از اطراف	۷
اے رئیسانِ این سوادِ عظیم	۱۱	وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم	۱۱
ہمچو من آرمیدۂ این شہر	۱۲	بہر کارے رسیدۂ این شہر	۱۲
اسد اللہ خان ہیچ مدان	۱۳	جادہ پیمائے وادیٔ حرمان[۳۲]	۱۳
گرچہ ناخواندہ میہمان شماست	۱۴	بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست	۱۴
بہ تظلم رسیدہ است این جا	۱۵	بہ امید آرمیدہ است این جا	۱۵

عابدی صاحب نے اپنی مرتبہ "گُلِ رعنا" میں بطور ضمیمہ "مثنوی آشتی نامہ" شامل کی ہے (صفحہ ۲۵۴ - ۲۶۴) لیکن اس کا ماخذ بیان "نامہائے فارسی غالب" (مرتبہ: سید اکبر علی ترمذی) ہے۔ یہ ترتیبِ اشعار کے اعتبار سے بھی اور بلحاظِ قرأتِ متن بھی نسخۂ "گُلِ رعنا" بخطِ غالب کے مشمولہ عکس سے مختلف ہے لیکن عابدی صاحب نے یہ اختلافاتِ نسخ ظاہر نہیں کیے۔ اوّل تو بخطِ غالب کا عکس چھاپنے اور نسخۂ "گل رعنا" بخطِ غالب سے استفادے کے دعوے کی صورت میں کسی ثانوی ماخذ کو متن میں جگہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا، اور کسی مخفی اہمیت کے باعث یہ مثنوی کسی دوسرے ماخذ سے نقل کر بھی لی گئی تھی تو نسخۂ "گل رعنا" بخطِ غالب کے مقابلے میں اختلافِ نسخ ظاہر نہ کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ یہی کہ دراصل نسخۂ "گل رعنا" نوشتۂ غالب، فاضل مرتب کے پیشِ نظر رہا ہی نہیں۔ اس کے دو مختلف صفحات کے جو عکس انھوں نے شاملِ اشاعت کیے ہیں، وہ بلا حوالہ چلتے چلتے "اشاریۂ غالب" سے لے لیے گئے ہیں۔

---

[۳۲] مطبوعہ "گُلِ رعنا" (عابدی) میں شعر کی صورت: اسد اللہ بخت برگشتہ
در غم و ہیچ عجز سرگشتہ

نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے مقابلے میں، سید وزیر الحسن عابدی کے مرتبہ متن کے ان الحاقات، اغلاط اور اختلافات سے بدیہی طور پر ایک نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ اُن کی تصحیح و تحقیق" کے ساتھ "گلِ رعنا" کا جو متن منظرِ عام پر آیا ہے وہ کم از کم نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب پر مبنی تو بالکل نہیں ہے اور نہ یہ تمام و کمال نسخۂ سویدا ہی کے مطابق ہے۔

دوسری بات جو وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ "گلِ رعنا" کا دیباچہ اور خاتمہ عابدی صاحب نے "پنج آہنگ" یا کلیاتِ نثرِ غالب" سے نقل کیا ہے، اس لیے کہ عابدی صاحب کے پیش کیے ہوئے "دیباچۂ گلِ رعنا" اور خصوصیت سے خاتمے کی نثر اور مطبوعہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" سے اس کی ہو بہو اور حیرت انگیز حد تک مطابقت سے ایک یہی نتیجہ اخذ کیا جانا ممکن ہے۔

سید وزیر الحسن عابدی کو نسخۂ سویدا مکتوبہ قاضی عزت اللہ دہلوی سے استفادے کا بھی دعویٰ ہے لیکن نسخۂ سویدا میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی نثر تو سرے سے موجود ہی نہیں اور "دیباچۂ گلِ رعنا" کے متنی تقابل سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ عابدی صاحب نے نسخۂ سویدا کے متن کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ تحریفات یہ بھی بتاتی ہیں کہ نسخہ سویدا سے استفادے کے لیے جس احساسِ ذمہ داری کی ضرورت تھی اسے روا نہیں رکھا گیا اور اصلاً "گلِ رعنا" کے خاتمے اور دیباچے کی نثروں کے لیے "پنج آہنگ" یا کلیاتِ نثرِ غالب" کو سامنے رکھا گیا ہے۔

عابدی صاحب نے دیباچے کی زائد عبارت کا ذکر کیا ہے:

> "گلِ رعنا" کے دیباچے کا جو اصل متن ہمیں ملا ہے وہ "پنج آہنگ" والے مطبوعہ متن سے نہ صرف چند لفظوں کے لحاظ سے مختلف ہے بلکہ اصل متن اور بعد کے مطبوعہ متن میں پوری دو عبارتوں کی کمی بیشی کا فرق ہے جو بہت اہمیت رکھتا ہے۔" [مقدمہ گلِ رعنا، ص ۲۰]

لیکن انھوں نے "خاتمۂ گل رعنا" کے بارے میں کچھ صراحت نہیں کی۔ اپنے مرتبہ متن کے صفحہ ۱۱۹ تا آخر صفحہ ۱۲۸ تک "خاتمۂ گل رعنا" پر ایک حاشیہ تک نہیں لکھا اور تعلیقات میں بھی کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس لیے میرے نزدیک انھوں نے دیباچے کی حد تک تو متن کو "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے نقل کیا اور نسخۂ سویدا سے اس کا سرسری مقابلہ کر کے زائد عبارت کو دیکھ لیا، لیکن "خاتمۂ گل رعنا" کی طویل نثر بالکلیہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے ماخوذ و منقول ہے۔ اس سلسلے میں سید قدرت نقوی کا بیان ملاحظہ ہو:

"خاتمۂ گل رعنا کا متن۔۔۔۔ (اور اس[ؔ۲۹] کی ترتیب (گل رعنا کے نسخۂ) عابدی میں مطبوعہ (متن) کے مطابق ہے۔۔۔۔ اور عابدی کے متن میں نسخۂ خواجہ (بخطِ غالب) کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ نسخۂ سویدا میں خاتمہ ہے نہیں کہ یہ اس کا متن خیال کر لیا جاتا۔ عابدی میں خاتمۂ (گل رعنا) غالباً "پنج آہنگ" سے لیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف (؟) نے 'دیباچے' کی زائد عبارت کا ذکر تو کیا ہے لیکن 'خاتمے' کے متعلق کچھ بھی معلومات فراہم نہیں فرمائیں۔ کلیات (نثر غالب) مطبوعہ میں شامل خاتمے کا جب (خاتمۂ گل رعنا، مرتبہ عابدی سے) مقابلہ کیا گیا تو حیرت انگیز طور پر (عابدی صاحب کے متن کو) اس سے منقول پایا اور بعض غلطیاں بھی (عابدی صاحب کے ہاں) بعینہٖ نقل ہو گئیں مثلاً:

"با جبینے چون گلِ خود رو شگفتہ" میں کلیات کے کاتب کے سہو سے جیم کا نقطہ یائے مجہول کی کشش سے مل کر مبہم ہو گیا ہے، یعنی اس طرح (با جیبے) لکھا ہے۔ اس روش میں فاضل مرتب (جناب عابدی) نے بالائی کشش کو

---

[۲۹] جو الفاظ ہلالین ( ) میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ توضیح کی غرض سے راقم الحروف نے بڑھائے ہیں۔
[م۔۱۰۔د]

"ش" خیال کر کے "باجنبشے" داخلِ متن کر لیا (ملاحظہ کیجیے نسخۂ عابدی، صفحہ ۱۱۹، سطر ۹)۔ اسی طرح "بجنبشِ نسیم تبسم غنچہ نیم شگفتہ اش صد چمن گل بالید" کلیات میں "نیم" کاتب نے غلط لکھ کر درستی کی ہے۔ نون کا نقطہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی مبہم حالت "سیم" سے ملتبس ہو گیا ہے۔ چنانچہ عابدی میں "سیم" ضبط کر لیا گیا ہے (دیکھیے: ص ۱۲۰، س ۲) بیشتر وہ باتیں جو مطبوعہ کلیات (نثرِ غالب) میں ہیں۔ عابدی کے مرتبہ متن) میں بھی ہیں، حالانکہ دیگر مخطوطات میں نہیں ہیں۔ مثلاً: خاتمے کی عبارت کے خاتمے پر "ط" (علامتِ فقط) دونوں میں ہے اور پہلی نثر درصنعتِ تعطیل کے القابی جملے کے خاتمے پر بھی "ط" (علامتِ فقط) دونوں میں ہے۔ (ملاحظہ کیجیے نسخہ عابدی ص ۱۲۳، س ۸)

[سہ ماہی "اردو"، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین صفحہ ۳۴-۳۵]

مختصر یہ کہ عابدی کے پیش کردہ "گلِ رعنا" کے دیباچے اور خاتمے کی حقیقت اور کیفیت تو بس یہ ہے۔ رہ گئی منظوم حصوں کی تکمیل کی بات، تو میرا اندازہ یہ ہے کہ عابدی صاحب کی یہ مشکل "گلِ رعنا" کے سلسلے میں مالک رام صاحب کے تعارفی مضامین نے آسان کی جن میں اہم اختلافاتِ متن کے ساتھ ساتھ، اردو کلام کے مشمولات اور فارسی مندرجات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ عابدی صاحب نے دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے:

"مالک رام صاحب نے اپنے ایک مقالے میں جو اعزازی مجموعے "نذرِ ذاکر" میں شائع ہوا ہے، "گلِ رعنا" کے اردو کلام کی نشان دہی کی ہے اور نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی اور مروجہ دیوانِ غالب کے حوالے سے بعض اہم اختلافاتِ متن بھی بتائے ہیں۔ پھر اپنے دوسرے مقالے میں جو "نگار"

لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ فارسی مندرجات کی نشان دہی کی ہے۔ جناب عرشی صاحب نے بھی اپنے مرتبہ دیوانِ غالب (اُردو) میں "گل رعنا" کی غزلیات اور اشعار کو حواشی اور تعلیقات میں مشخص کر دیا ہے۔"

[مقدمۂ گل رعنا، عابدی، صفحہ ۱۹، ۲۰]

"مالک رام صاحب کے قیمتی مقالوں سے پہلے غالبیات میں "گل رعنا" کی صرف دو چیزیں دیباچہ اور خاتمہ معلوم اور محفوظ تھیں جنہیں غالب نے "پنج آہنگ" میں شامل کر لیا تھا۔"

[مقدمۂ گل رعنا، عابدی، صفحہ ۱۸]

واقعہ یہ ہے کہ عابدی صاحب نے مالک رام کے مضامین اور دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے حواشی اور تعلیقات کی مدد سے "گل رعنا" کا متن تعمیر کیا ہے۔ اُن کا یہ اِدّعا کہ انھوں نے "گل رعنا" کے نسخۂ غالب، بخطِ غالب (نسخۂ خواجہ محمد حسن) کو بامعانِ نظر دیکھا ہے، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

سید وزیر الحسن عابدی نے نسخۂ "گل رعنا" بخطِ غالب کے علاوہ "گل رعنا" کے ایک اور معاصر قلمی نسخے (نسخۂ سویدا) مکتوبہ قاضی عزت اللہ دہلوی سے بھی استفادے کا دعویٰ کیا ہے۔ "عکسِ گل" کے زیرِ عنوان اُنھوں نے نسخۂ سویدا کے چھ صفحات کے تین نمونے شائع کیے ہیں۔ پہلا نسخۂ سویدا میں دیباچے کے پہلے دو صفحات کے عکس پر مبنی ہے۔ نمونہ ۲، دیباچے کے باقی حصے یعنی تیسرے اور چوتھے صفحے کے عکس پر مشتمل ہے اور نمونہ ۳ کے تحت عابدی صاحب نے نسخۂ سویدا کے دو آخری صفحات کے عکس دیے ہیں۔

ان چھ صفحات کے عکسوں کی بنا پر اس نسخے (نسخۂ سویدا) کے بارے میں کچھ باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں دیباچۂ گل رعنا" کی عبارت، بڑی حد تک نسخۂ غالب بخطِ غالب کے مطابق ہے۔ اس نسخے میں دیباچے پر جو تاریخ درج ہے، وہ عکس میں اتنی مدھم

آئی ہے کہ اُس کا پڑھ لینا ممکن نہیں۔ عابدی صاحب نے اسے ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۴۵ ہجری مطابق ۹۔مئی ۱۸۳۰ء بتایا ہے (مقدمۂ گل رعنا، ص ۲۱) گویا یہ نسخہ "گل رعنا" کے اصلی نسخۂ بخطِ غالب کے تقریباً پونے دو سال بعد لکھا جانا شروع ہوا۔

نسخۂ سویدا کے دیباچے کے متن کی بنیاد پر عابدی صاحب کے مرتبہ دیباچۂ "گل رعنا" میں بعض زائد عبارتیں ضبط میں آئی ہیں لیکن جیسا کہ اس سے پہلے اختلافِ نسخ میں نشاندہی کی جا چکی ہے۔ نسخۂ سویدا کے دیباچے کی عبارت کو عابدی صاحب نے پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا اور شاید یہ دیباچہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی مطبوعہ نسخے سے نقل کیا ہے۔ اسی لیے "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کے مطبوعہ نسخوں میں جو غلطیاں تھیں، وہ عابدی صاحب کے متن میں بھی در آئی ہیں۔ ان میں بعض صریحاً ایسی ہیں کہ نسخۂ سویدا کو توجہ سے دیکھ لیا جاتا تو اُن سے بچا جا سکتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ نسخۂ سویدا "گل رعنا" کا کوئی مکمل مخطوطہ نہیں ہے۔ یہ ناقص بھی ہے اور نا تمام بھی۔ اسے چند اشعار یا زیادہ سے زیادہ صرف چند غزلوں پر مشتمل "گل رعنا" کا ایک بے حد مجمل انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ دیباچۂ "گل رعنا" کو نقل کر چکنے کے بعد، جو چوتھے صفحے کی چھٹی سطر پر تمام ہوا ہے، اسی سطر کے بقیہ حصّے میں کاتب نے "چند اشعار نوشتہ شد" کی عبارت کا اضافہ کر کے اگلی سطر سے نثر نویسی کے انداز میں مسلسل شعر نقل کرنا شروع کر دیے ہیں۔ نسخۂ سویدا کے چوتھے صفحے پر دیباچے کے بعد ساتویں سطر سے آخری یعنی چودھویں سطر تک کل آٹھ سطروں میں تیرہ اُردو شعر نقل ہوئے ہیں اور یہ اس ترتیب سے آئے ہیں :

۱۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا
۲۔ لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت، گیا اور بُود، تھا

۳۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی[۳۵] — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

○

۴۔ دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا — زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا[۳۶]

۵۔ خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا

○

۶۔ عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا، کہ صحرا جل گیا[۳۷]

○

۷۔ محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

○

۸۔ محرم نہیں ہے تو ہی، نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

---

۳۵ عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۱) میں "ڈھانکا" بجائے: ڈھانپا۔ عابدی صاحب نے حاشیے میں ظاہر کیا ہے کہ 'ڈھانپا' عام مطبوعہ متن میں ملتا ہے لیکن ہمارے متن میں 'ڈھانکا' ہے لیکن نسخۂ سویدا کے اس صفحے کا جو عکس عابدی صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے، اُس میں موصوف کے اظہار کے برعکس متن میں 'ڈھانپا' موجود ہے۔

۳۶ اس شعر کے بعد عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۲) میں یہ دو شعر زائد ہیں:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک — ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی (ق) — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

عابدی صاحب نے حاشیے یا تعلیقات میں کہیں اس کی نشاندہی نہیں کی کہ یہ دو شعر نسخۂ سویدا سے محذوف ہیں۔ نیز مصرعۂ اول میں 'گزری' کا املا عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں 'ز' کے بجائے ذال معجمہ فارسی سے کیا گیا ہے۔

۳۷ اس شعر سے پہلے عابدی صاحب کے مطبوعہ متن (ص ۱۲) میں یہ شعر، بمقابلہ نسخۂ سویدا بغیر کسی تصریح کے زائد:

دل نہیں، تجھ کو دکھاؤں ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

۹۔ تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز | میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

۱۰۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے | ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

۱۱۔ تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ | سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

○

۱۲۔ پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں | میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

۱۳۔ آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے | ہم بھی یک[شہ] اپنی ہوا باندھتے ہیں

ان اشعار سے نسخۂ سویدا کے حصۂ اُردو کی جو کیفیت نظر کے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ نسخۂ سویدا کا آغاز، دیوانِ غالب کے معروف مطلعِ اوّل "نقش فریادی ہے......" سے نہیں ہوا۔ نسخۂ سویدا کے پہلے تین شعر "گل رعنا" (عابدی) کی دوسری غزل سے ہیں جو "گل رعنا" میں تین اشعار ہی پر مشتمل ہے۔ شعر ۴ اور ۵ عابدی صاحب کے متن میں باعتبارِ ترتیب تیسری غزل سے ہیں۔ متداول دیوان میں اس غزل کے اشعار کی تعداد سات ہے "گل رعنا" میں اس کے چار شعر منتخب ہوئے، نسخۂ سویدا میں صرف دو نقل ہوئے ہیں۔

نسخۂ سویدا کا چھٹا شعر "گل رعنا" (عابدی) کی پانچویں غزل سے ہے جس میں دو شعر ہیں۔ ساتواں شعر، دسویں غزل کا واحد شعر ہے۔ شعر ۸ تا ۱۱ "گل رعنا" (عابدی) کی گیارھویں غزل پر مشتمل ہے اور نسخۂ سویدا کا بارھواں تیرھواں شعر، اُس غزل کے پہلے دو شعر ہیں "گل رعنا" (عابدی) میں جس کا ترتیبی شمارہ اکسٹھ ہے۔ گویا "گل رعنا" (عابدی) کے حصۂ اُردو کی پہلی ساٹھ غزلوں میں سے (جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۴۲ ہے) نسخۂ سویدا میں چھ متفرق غزلوں کے صرف گیارہ شعر نقل ہوئے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اصل کے مقابلے میں نسخۂ سویدا کے حصۂ اُردو کے بقیہ مندرجات کا تناسب بھی

[شہ] عابدی صاحب کے متن میں 'یک' کے بجائے 'اک' لکھا ہے لیکن حاشیے یا تعلیقات میں اس کا اختلاف ظاہر نہیں کیا۔

ایسا ہی مجمل اور قلیل ہو گا۔

نسخۂ سویدا کے حصۂ فارسی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ۔ نسخۂ سویدا کے آخری دو صفحات کے عکس، عابدی صاحب نے نمونہ "۳" کے طور پر شائع کیے ہیں۔ ان میں اشعار کی کتابت سہ کالمی انداز میں ہوئی ہے۔ آخری صفحے سے متصل صفحے کا پہلا شعر یہ ہے:

رازدارِ تو و بدنام کنِ تقدیریم
ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

اس صفحے پر بائیس شعر آئے ہیں، آخری شعر یہ ہے

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وارسیم ہمان قلزمیم ما

آخری صفحے پر 'گمیم ما ، قلزمیم ما' والی اس غزل کے بہ ترتیبِ ذیل تین کالموں میں یہ چھ شعر آئے ہیں :

در خاک از ہوائے گل و شمع فارغیم	از توسن تو طالبِ نقشِ سمیم ما
از حد گزشت شکوہ و دستار ریش شیخ	حیران این درازی یال و دمیم ما
تمکین ما ز چرخ سبک سر بباد رفت	خوش دستگاہ انجمن انجمیم ما[۵]
پنہاں بہ عالمیم ز بس عین عالمیم	چون قطرہ در روانی دریا گمیم ما
مارا مدد ز فیض ظہوری ست در سخن	چون جام بادہ راتبہ خوار خمیم ما
غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشم	گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

---

۵ اس شعر کے بعد عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۰۰) میں بمقابلہ نسخۂ سویدا بطور حاشیہ یہ دو شعر زائد ہیں :

مردم بہ کینہ تشنۂ خون ہمند و بس	خون می خوریم چون ہم ازین مردمیم ما
دست زما بشوی مسیحا کہ زیر خاک	آب از تف شکیب صدای قمیم ما

"گل رعنا" (عابدی) میں غالب کی ستائیس فارسی غزلیں ہیں ، یہ باعتبار ترتیب نویں غزل ہے۔ نسخۂ سویدا اسی غزل پر تمام ہوجاتا ہے۔ ان اشعار سے عین متصل وسطی کالم میں ترقیمہ ہے ، جس کی پہلی سطر یہ ہے :

" تمام شد گل رعنا بتاریخ .... سنہ ہجرے "[۴۰]

گویا نسخۂ سویدا میں حصۂ فارسی کی کم از کم آخری اٹھارہ غزلیں اور خاتمۂ "گل رعنا" کی نثر سرے سے نقل ہی نہیں ہوئی۔ خود عابدی صاحب کے بقول :

"نسخۂ جمال سویدا کی منتخبات میں جا بجا غزلیں یا بعض اشعار ساقط ہیں اور صفحات کو بیاض (یعنی : سادہ) چھوڑ دیا گیا ہے۔ قاضی عزت اللہ نے شروع میں خود بھی لکھ دیا ہے : "بعضی[۴۱] اشعار نوشتہ شد"

[مقدمہ گل رعنا ، ص ۴۴]

لیکن عابدی صاحب نے "متن کتاب میں 'بیاض' کی نشاندہی نہیں کی"[۴۲] کیونکہ نسخۂ خواجہ بخطِ غالب کے کتابیاتی کوائف دینے پر وہ قادر نہیں تھے ، انھوں نے نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف سے بھی چشم پوشی کی ہے۔ اس سلسلے میں عذر انھوں نے یہ کیا ہے کہ :

"نسخۂ خواجہ اور نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف ہم یہاں اس لیے درج نہیں کرتے کہ امید ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب محترم اور محب مکرم جناب

---

[۴۰] اس تاریخ کا عکس اتنا مدھم ہے کہ عکس کی مدد سے اس کا پڑھ پانا ممکن نہیں۔ عابدی صاحب نے نسخۂ سویدا کی کتابت کی تاریخِ تکمیل ۲۰۔ ذی قعدہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۲۹۔ فروری ۱۸۳۷ء بتائی ہے۔ (مقدمہ ، ص ۲۱)

[۴۱] "بعضی" عابدی صاحب کا سہو قلم ہے ، اس لیے کہ اصل میں "بعضی" کے بجائے لفظ "چند" ہے۔ دیکھیے : "گل رعنا" (عابدی) میں نسخۂ سویدا کے دیباچے کا عکس ، صفحہ ۴ ، سطر ۶۔

[۴۲] سید قدرت نقوی ، سہ ماہی اردو ، کراچی ، شمارہ ۱ ، ۱۹۷۱ء ، مستقل مضامین ، ص ۲۳

حکیم صاحب اپنے اپنے نسخے کی عکسی طباعت و اشاعت کا کبھی نہ کبھی اہتمام فرمائیں گے[۲۲] — پھر یہ چیزیں ایک حد تک "اشاریۂ غالب" (شائع کردہ مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں محفوظ ہو گئی ہیں جو جناب سید معین الرحمٰن صاحب[۲۳] نے مرتب کیا ہے۔"

[سید وزیر الحسن عابدی، مقدمہ گلِ رعنا، صفحہ ۴۴]

نسخۂ خواجہ اور نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف درج نہ کرنے کے بارے میں عابدی صاحب کا یہ بیان محض عذرِ بارد ہے۔ اصل یہ ہے کہ نسخۂ خواجہ بخطِ غالب کے کتابیاتی کوائف وہ اس لیے درج نہیں کر سکے کہ یہ نسخہ انھیں میسر ہی نہیں آیا۔ اس کے کتابیاتی کوائف وہ راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" کے حوالے سے درج کرتے تو یہ تاثر کہ انھیں اصل خطی نسخے سے راست

---

[۲۳] "کیا ہی اچھا ہوتا کہ موصوف اس امید سے قطع نظر کرتے ہوئے کتابیاتی کوائف تحریر فرما دیتے تو اہلِ تحقیق کو ان دونوں نسخوں کے متعلق کھل کر اظہارِ رائے کا حق مل جاتا۔ صفحات کے عکس اور متن مطبوعہ کا ہم نے بڑی دشواری سے مقابلہ کیا تو ہمیں اختلاف نظر آیا اور یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ آخر یہ اختلاف دور کرنے اور نشاندہی کرنے میں کون سا امر مانع ہوا؟ مقدمہ میں بھی عابدی صاحب نے ان امور کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی جس سے یہ گتھی سلجھ سکتی۔"

[سید قدرت نقوی، اُردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین، صفحہ ۲۹]

[۲۴] "نسخۂ خواجہ (بخطِ غالب) کے متعلق سب سے پہلے سید معین الرحمٰن نے اطلاع بہم پہنچائی۔ وزیر الحسن عابدی صاحب نے بھی اس سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے مگر اس کا تعارف نہیں کرایا، نیز اپنی مرتبہ "گلِ رعنا" کے متن میں اس سے کام لینے کا اعتراف کیا ہے، لیکن اختلافِ نسخ میں اس کے متن کا بدل نہیں دکھایا۔ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ عابدی صاحب کے محققانہ دیباچے میں اس نسخے کے تعارف کا نہ ہونا بڑی شدت سے محسوس کیا گیا۔

[سید قدرت نقوی، اُردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین، صفحہ ۲۲]

استفادے کا موقع ملا ہے، اور یہ کہ ان کا پیش کردہ متن بخطِ غالب پر مبنی ہے، زائل ہو سکتا تھا۔

نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف وہ دے سکتے تھے لیکن یہ بدیں مصلحت نہیں دیے کہ دو قلمی نسخوں سے استفادے کا دعویٰ ہے، صرف ایک کے کتابیاتی کوائف درج کریں اور دوسرے کے نہ دیں تو اس ناہمواری کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، یوں بھی نسخۂ سویدا کا تعارف کرانا اور اس کے کوائف درج کرنا اپنے کام کو ہلکا کرنا تھا، اس لیے کہ یہ مخطوطہ، جیسا کہ عرض کیا جا چکا "گل رعنا" کا کوئی مکمل مخطوطہ نہیں ہے۔ یہ ناقص بھی ہے، ناتمام بھی۔ اس میں جا بجا غزلیں کی غزلیں محذوف اور اشعار ساقط ہیں اور خاتمے کی نثر، سرے سے موجود ہی نہیں۔

نسخۂ سویدا کا ذکر "اشاریۂ غالب" میں ضمناً صرف دو مقامات پر آیا ہے:

"گل رعنا کا ایک خطی نسخہ۔ لاہور میں حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا صاحب، نبیرۂ حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس محفوظ ہے"

[اشاریۂ غالب، ص ۲۹۹]

"اس مخطوطے کا کاتب مجہول الاسم ہے، لیکن اس کی کتابت بہر طور معاصر ہے"

[اشاریۂ غالب، ص ۳۹۹]

ظاہر ہے، یہ ایسی شافی اور کافی معلومات نہیں ہیں کہ عابدی صاحب کو اس نسخے کے کتابیاتی کوائف دینے میں مانع ہوتیں۔ اس لیے نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف کے بارے میں عابدی صاحب کے اس بیان سے کہ:

"یہ چیزیں ایک حد تک "اشاریۂ غالب" میں محفوظ ہو گئی ہیں۔"

[مقدمۂ گل رعنا (عابدی)، صفحہ ۳۴]

غالب [illegible] کا کوئی طالب علم مطمئن نہیں ہو سکتا ــــ

سید وزیر الحسن عابدی کا بنیادی موقف یہ ہے کہ:

گل رعنا" کے بارے میں "ہماری معلومات کا ماخذ کتاب کے تین نسخے ہیں :

۱. نسخۂ مالک رام

۲. نسخۂ غالب (نسخۂ خواجہ)

۳. نسخۂ قاضی عزّت اللہ دہلوی (نسخۂ سویدا)

..... لاہور کے دو قلمی نسخوں کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ

"گل رعنا" کا اصل متن وہی ہے جو مالک رام کے مقالوں سے صورت پذیر

ہوتا ہے ۔" [مقدمۂ "گل رعنا" (عابدی) ص ۱۹-۲۰]

لیکن عابدی صاحب کی یہ بات کہ "ہماری معلومات کا ماخذ "کتاب کے مندرجہ" تین نسخے" ہیں محض برائے بیت ہے ۔ حقیقت اس کے برعکس، وہ ہے جو پیشِ نظر مواخذے سے برآمد ہوتی ہے ، یعنی سیّد وزیر الحسن عابدی نے "تصحیح و تحقیق" کے ساتھ "گل رعنا" کا جو متن شائع کیا ہے ، اس کا :

۱. دیباچہ : "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبوعہ سے ماخوذ ہے ۔ نسخۂ سویدا سے اس کا سرسری مقابلہ کر کے زائد عبارتوں کو ضبط کر لیا گیا ہے ۔

۲. خاتمہ : یہ من وعن "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبوعہ سے منقول ہے ۔

۳. منظوم حصے : منظوم حصوں کی تکمیل جناب مالک رام کے اُن مقالات کی مدد سے کی گئی ہے جن میں اہم اختلافاتِ متن کے ساتھ ساتھ اُردو کلام کے مشمولات اور حصّۂ فارسی کے مندرجات کی واضح طور پر نشاندہی اور صراحت موجود ہے ۔ اس ضمن میں دیوانِ غالب (اُردو) نسخۂ عرشی (۱۹۵۸ء) سے بھی

فائدہ اُٹھایا گیا ہے، جس میں گُل رعنا کی غزلیات اور اشعار
کو مولانا امتیاز علی عرشی نے حواشی اور تعلیقات میں متعین کر دیا ہے۔

۴۔ آغازِ فارسی کی نثر: فارسی کلام کے آغاز میں جو پنج سطری نثر بطور "گریز" یا
تمہید آئی ہے، اُسے گُل رعنا کے حصۂ فارسی کے تعارفی
مقالے از: مالک رام، مطبوعہ: نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۹۰ء
سے حاصل کیا گیا ہے۔

۵۔ دو عکس: "گُل رعنا" (عابدی) میں "گُلِ رعنا" نسخۂ غالب بخطِ غالب
کے دو متفرق صفحات کے عکس بھی شاملِ اشاعت کیے گئے
ہیں۔ یہ مغالطہ انگیز ہیں؛ انھیں بلا حوالہ راقم الحروف کی
کتاب "اشاریۂ غالب" (۱۹۶۹ء) سے لے لیا گیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ سید وزیر الحسن عابدی کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ "گُل رعنا" کا جو متن شائع ہو کر سامنے آیا ہے، اُس کی کوئی معتبر اور واقعی بنیاد نہیں ہے۔ یہ اُن کے ادعا کے برعکس "گُل رعنا کے اصلی اور نادر نسخے، نسخۂ خواجہ محمد حسن، بخطِ غالب پر مبنی نہیں ہے، اس لیے اس متن کو نوشتۂ غالب کے بمنزلہ سمجھ کر، اس سے استفادہ کرنا، اپنے آپ کو مغالطے اور تاریکی میں رکھنا ہوگا۔

عابدی صاحب کی یہ کتاب 'ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان' پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی جانب سے، متروکہ اوقاف بورڈ، حکومتِ پاکستان کی مالی امداد سے معروف غالب شناس ڈاکٹر شیخ محمد اکرام[۵۵] کے اس "پیش لفظ" کے ساتھ شائع ہوئی ہے:

---

۵۵ شیخ محمد اکرام مرحوم پر بعنوان: "ایس۔ ایم۔ اکرام — بطورِ غالب شناس" حال ہی میں (۱۹۷۶ء) بہ تفصیلِ ذیل ایک اچھا کام ہوا ہے:
تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے امتحان (۷۴-۱۹۷۳ء) ایم۔ اے۔ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،
صفحات ۲۱۸، مقالہ نگار: قمر النساء شیخ، نگرانِ کار: پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمن

"غالب کے منتخب اُردو اور فارسی کلام کا اولین مجموعہ "گل رعنا" اب تک تصانیفِ غالب کا گوہرِ گم شدہ اور غالبیات کا حلقۂ مفقودہ رہا ہے۔ البتہ کچھ عرصہ پہلے ہندوستان میں "ذکرِ غالب" کے نامور مصنف مالک رام صاحب کو اس کا ایک خطی نسخہ ملا تھا، جس کا انھوں نے اپنے دو گراں قدر مقالوں میں تعارف کرایا ہے۔۔۔۔ زیرِ نظر نسخے کے مرتب سید وزیر الحسن عابدی دبیغور سِس اور صاحب نظر محقق ہیں۔ نوادرِ غالب کی انھیں خاص طور پر تلاش رہتی ہے، لیکن ان کا فرمانا ہے کہ محض قسمتی تھی کہ انھیں لاہور میں "گل رعنا" کے دو ایسے مستند نسخوں تک رسائی حاصل ہو گئی، جن میں سے ایک غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا غالب کے ایک دوست کا تحریر کردہ ہے جس نے غالب سے کتاب لے کر، اسے نقل کیا تھا۔۔۔۔۔۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کی تقریب میں ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان دلدادگانِ غالب کی خدمت میں ایک ہدیۂ نادر پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔"

[پیش لفظ، صفحہ ۳]

سید وزیر الحسن عابدی نے اپنے مقدمے کو ان کلمات پر ختم کیا ہے:

"آخر میں "غالب نامہ" کے نامی مصنف مخدومی جناب ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب ستارۂ پاکستان کی خدمت میں یہ حقیر مرتب سپاس کے گل ہائے اخلاص نذر کرتا ہے کہ قوم کے تہذیبی سرمائے سے قیمتی موتیوں کے انتخاب میں موصوف کی دیدہ وری اور علم پروری کی بدولت

پورے ڈیڑھ سو[۶۹] برس کی گم گشتگی کے بعد ہمارے ادب کا یہ مٹا ہوا نقش،
اہلِ علم و ادب کے ذوقِ نظر کے لیے پھر نمودار اور محفوظ ہو سکا . . . . .
مطبعِ عالیہ، لاہور کے مالک جناب اظہار الحسن صاحب رضوی نے متن
میں اضافتوں کے اظہار اور فصل و وصلِ کلمات کی پابندی کے ساتھ شروع
سے آخر تک حُسنِ طباعت کا اہتمام رکھا اور طباعتی صحت کے معیار کے
لحاظ سے بھی مرتّب کو ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان سے سرخرو ہونے کا موقع
دیا۔ وما توفیقی اِلّا باللہ "۔ [مقدّمہ، صفحہ ۱۸]

بشکلِ موجودہ، یہ کتاب طباعتی حسن و صحت کے معیار کے لحاظ سے ہی قابلِ اطمینان ہے، کاش یہ متنی ترتیب و تحقیق کے اعتبار سے بھی ایسی ہوتی! اس صورت میں یقیناً یہ "دلدادگانِ غالب" کے لیے "ہدیۂ نادر" قرار پاتی ـــ

"گُل رعنا" (عابدی) کے سقیم متن سے قطعِ نظر، چند باتیں "گُل رعنا" (عابدی) کے مقدّمے کے بارے میں ـــ عابدی صاحب نے مقدّمے میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

---

۶۹ "پورے ڈیڑھ سو برس کی گم گشتگی" کا ٹکڑا محلِ نظر ہے۔ "گُل رعنا" ستمبر ۱۸۲۸ء میں مدوّن ہوئی۔ اس واقعے کو ستمبر ۱۹۷۸ء میں ڈیڑھ سو برس "پورے" ہوں گے۔ پھر "گُل رعنا" بابت غالب مدوّن اور مرتّب ہوتے ہی "گم" نہیں ہو گئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا حسرت موہانی نے دیوانِ غالب کی شرح لکھی تو "گُل رعنا" اُن کے پیشِ نظر تھی۔ ۱۹۴۲ء تک کم از کم اس کا حصّۂ اُردو ان کے پاس موجود اور محفوظ تھا (دیکھیے: انتخابِ غالب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ۱۹۴۲ء، دیباچہ، صفحہ ک)۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں اس کا ایک مکمل خطّی نسخہ بھی نمودار ہو گیا (مخزونہ کتاب خانۂ مالک رام، دہلی)۔ اس لیے عابدی صاحب کا یہ کہنا کہ:

> "ادب کا یہ مٹا ہوا نقش، پورے ڈیڑھ سو برس کی گم گشتگی
> کے بعد پھر نمودار اور محفوظ ہو سکا"

زیادہ صحیح نہیں ہے۔

"حال ہی محمد طفیل صاحب نے "نقوش" کے غالب نمبر کی دوسری جلد میں غالب کا نودریافت دیوانِ اُردو، بیاضِ غالب اور نسخۂ لاہور کے نام سے شائع کیا ہے . . . . عرشی صاحب نے اپنے ایک مقالے میں اس نسخے کو ۱۸۱۶ء کا کتابت شدہ مانا ہے۔ نثار احمد فاروقی صاحب نے بھی سالِ کتابت کا یہی تعین کیا ہے۔ مہر صاحب[۴۷] کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ فی الحال یہ مسئلہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں، اس لیے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ بہرحال دو چیزیں ہماری نظر میں واضح ہیں، ایک یہ کہ اُنیس غزلیں اس نسخے میں زائد ہیں۔ دوسرے اس نسخے کا متن بہت سے . . . . مقامات پر . . . . . . "نسخۂ حمیدیہ" کے متن سے مختلف ہے۔" [مقدمہ (عابدی)، ص ۳۰]

یہ درست نہیں کہ نودریافت دیوانِ غالب میں اُنیس غزلیں زائد ہیں۔ ایسی زائد غزلوں کی صحیح تعداد پچیس[۴۸] ہے جو پہلی بار اس نودریافت دیوانِ غالب کے ذریعے سامنے آئیں۔ یہ غلطی نثار احمد فاروقی صاحب کے بیان کو اپنانے کا نتیجہ ہے۔ فاروقی صاحب نے اول زائد غزلوں کی تعداد اُنیس ہی بتائی تھی[۴۹]۔ عابدی صاحب اگر تعداد کو فاروقی صاحب کے حوالے سے پیش کرتے تو اس تعداد کے غلط یا صحیح ہونے کے بوجھ سے بری الذمہ ہوتے اور گرفت سے بچ جاتے لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر یہ چیز "ہماری نظر میں واضح" ہے، اپنے آپ کو مشکل میں

---

[۴۷] حال ہی میں (۱۹۷۶ء) مولانا مہر مرحوم پہ بعنوان: "مولانا غلام رسول مہر۔ بطور غالب شناس" ایک مفید کام ہوا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:
تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے امتحان (۱۹۷۴ء) ایم۔اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
صفحات: ۲۰۳ مقالہ نگار: نیر سلطانہ نگران کار: پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمن

[۴۸] غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ، ڈاکٹر سید معین الرحمن، ۱۹۷۰ء، ص ۵۱۵

[۴۹] نقوش، لاہور، غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۳۹

میں ڈال لیا ہے۔

اب ایک دوسری بات : عابدی صاحب نے مقدمۂ کتاب میں دو مختلف مواقع پر یہ لکھا ہے کہ :

"سب سے پہلے مثنوی" بادِ مخالف" کی اوّلین روایت مخدومی جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے غالب کے غیر مطبوعہ مکتوبات اور منظومات کے اپنے مرتبہ مجموعے "متفرقاتِ غالب" میں درج کی تھی۔ اس کے بعد جناب قاضی عبد الودود صاحب نے اپنے ایک مقالے (ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۵ء) میں اس کے اُس متن کا ذکر کیا ہے، جو اب جناب سید اکبر علی ترمذی کے مرتبہ مجموعے " نامہ ہائے فارسی غالب" (۱۹۶۹ء) میں شائع ہوا ہے"

[مقدمہ (عابدی) ص۹۱]

"جناب قاضی عبد الودود صاحب کا مقالہ (ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۵ء) بھی جو اسی مجموعے ("نامہ ہائے فارسی غالب") کے مندرجات پر مبنی ہے، اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے۔"

[مقدمہ (عابدی) ص۹۴]

عابدی صاحب کے ان بیانات کے بارے میں مجھے چند باتیں کہنی ہیں :

۱۔ "نامہائے فارسی غالب" کے مندرجات پر قاضی عبدالودود صاحب کا کوئی مقالہ قطع نظر اس سے کہ وہ "اہمیت رکھتا ہو" یا نہ، ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شائع نہیں ہوا۔ اور "نامہائے فارسی غالب" کے مندرجات پر قاضی صاحب کے مضمون یا مقالے ہی کا کیا مذکور، فروری ۱۹۶۵ء کے رسالہ " ماہِ نو " (کراچی) میں سرے سے جناب قاضی عبدالودود کی کوئی تحریر ہی شائع نہیں ہوئی۔

۲۔ قاضی عبدالودود صاحب نے "ماہِ نو" کے اپنے کسی مقالے میں "بادِ مخالف" کے اُس متن کا ذکر نہیں کیا، جو اب " نامہائے فارسی غالب" میں شائع ہوا ہے۔ قاضی صاحب کے

ایک مقالے (ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۲ء، ص۔۱۰) میں غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط ضرور شامل ہے جو "بادِ مخالف" سے متعلق ہے۔

۳۔ میرے علم اور مطالعے کی حد تک قاضی عبدالودود صاحب نے "نامہائے فارسی غالب" میں شامل "بادِ مخالفت" کے متن اور اس کے بعض اختلافات کا ذکر پہلی بار اپنے اُس مضمون میں کیا ہے جو "مجموعۂ دہلی اور غالب" کے عنوان سے رسالہ "اُردو" کراچی کے شمارۂ خصوصی بیادِ غالب، (جلد ۴۵، شمارہ ۱) جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے (دیکھیے رسالۂ مذکور صفحہ ۱۳۹۔۱۴۰)۔ یہ مقالہ "نامہائے فارسی غالب" کے مندرجات کا "اُردو خلاصہ" ہے۔ ۳۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے (ص ۱۰۳ ۔ ۱۴۰) اور اہمیت رکھتا ہے گو خود قاضی صاحب اس سے مطمئن نہیں ہیں:

"مجھے اس کا افسوس ہے، میں یہ مقالہ حسبِ دلخواہ نہیں لکھ سکا۔"

[اُردو، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص۱۰۲]

۴۔ "بادِ مخالف" کی اوّلین روایت توضیح شکل میں "گل رعنا" بخطِ غالب کے نسخۂ خواجہ کے ذریعے سامنے آئی ہے اور عابدی صاحب اس ماخذ سے محروم رہے ہیں۔ ورنہ وہ یہ نہ لکھتے کہ "بادِ مخالف" کی اوّلین روایت مسعود حسن رضوی صاحب نے پیش کی ہے رضوی صاحب نے "متفرقاتِ غالب" میں اس مثنوی کی جو روایت درج کی ہے وہ تمام وکمال اوّلین روایت نہیں ہے۔ اوّلین روایت سے مشابہ ضرور ہے اسی سے مماثل ایک روایت، قاضی عبدالودود صاحب برسوں پہلے حکیم حبیب الرحمٰن خان مرحوم (ڈھاکا) کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ، غالب کے فارسی خطوط کے ایک مجموعے سے نقل کرکے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، مسلینی، جلد ۱، آئی آر اے سیریز[۱۲] بابت ۱۹۴۸ء میں شائع کرچکے ہیں۔

"گل رعنا" کے مقدمے اور ایک ضمیمے میں عابدی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"کلکتے والے اعتراضات کے ہنگامے کی تفصیل جو ایک نئی دریافت کے مطابق ہے، ہم نے "گل رعنا" کے ضمیمے میں درج کی ہے اور مثنوی "بادِ مخالف" کی اولین روایت بھی آخر میں شامل کر دی ہے۔"

[مقدمۂ گلِ رعنا (عابدی)، ص ۱۶]

"غالب کی ایک فارسی تحریر جس میں انھوں نے کلکتے کے ہنگامے کی تفصیل درج کی ہے، جناب سیّد اکبر علی صاحب ترمذی کو ایک مجموعے میں ملی ہے جسے موصوف نے اپنے مرتّب کردہ "نامہائے فارسی غالب" (غالب اکیڈمی، دلی، فروری ۱۹۶۹ء) میں درج کیا ہے۔ ہم اُن کے دلی شکریے کے ساتھ اس اہم نگارش کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔"

[ضمیمہ ۲، گلِ رعنا (عابدی)، ص ۲۵۰]

اس سلسلے میں مجھے دو باتیں کہنا ہیں:

۱۔ کلکتے والے اعتراض کے ہنگامے کی تفصیل پر مشتمل، غالب کی ایک فارسی تحریر، جسے "نئی دریافت" قرار دے کر عابدی صاحب نے ۱۹۶۹ء کے مطبوعہ ایک ماخذ سے نقل کیا ہے، اس ماخذ (نامہائے فارسی غالب) میں شائع ہونے سے سات برس پہلے قاضی عبدالودود صاحب کے ایک مقالے کے ذریعے منصۂ شہود پر آ کر غالب دوستوں کی ضیافتِ طبع کا باعث ہوئی تھی۔ رجوع کیجیے:

[ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۲ء، ص ۹]

۲۔ مثنوی "بادِ مخالف" جس کی روایت کو عابدی صاحب نے "اوّلین" بتایا ہے اور جسے اُنھوں نے اپنی مرتبہ "گل رعنا" کے ایک ضمیمے کے آخر میں شامل کیا ہے (ص ۲۵۴-۲۶۴)، وہ اس مثنوی کی "اولین روایت" نہیں ہے۔ "بادِ مخالف" کی اوّلین روایت، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، وہ ہے جو "گلِ رعنا" بخطِ غالب

نسخۂ خواجہ کے آخر میں درج ہے اور جس سے بڑی حد تک مماثل اور مشابہ ایک روایت پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے مرتبہ مجموعے "متفرقاتِ غالب" مطبوعہ ۱۹۴۷ء (ص ۱۱۵--۱۴۰) میں اور قاضی عبدالودود صاحب کے ایک مضمون مطبوعہ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، مسلینیؔ جلد ۱ آئی، آر، اے سیریز نمبر ۱۲، بابت ۱۹۴۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔

عابدی صاحب کی منقولہ "بادِ مخالف" کی روایت "نامہائے فارسی غالب" سے ماخوذ ہے۔ یہ کچھ اختلافات کے ساتھ وہی ہے جو غالب کے "دیوان فارسی" میں ہے اور یہ "بادِ مخالف" کی اوّلین روایت سے بہت مختلف ہے۔

ایک بات اور : عابدی صاحب نے اپنے مرتبہ متن کے فارسی اشعار کی کل تعداد مقدمے میں (صفحہ ۴۱) ۴۵۹ بتائی ہے، لیکن اصلاً اُن کے متن میں جو اشعار چھپے ہیں وہ تعداد میں ۴۶۳ ہیں — اور اب اس سلسلے کی آخری بات : عابدی صاحب نے مقدمے میں ایک جگہ لکھا کہ :

> "اُردو غزلیں ۱۸۲۸ء کے نسخے (نسخۂ خواجہ) میں ۱۱۹ اور ۱۸۳۰ء کے نسخے (نسخۂ سویدا) میں ۱۱۷ ہیں۔ لیکن فارسی غزلیں "گل رعنا" کے تینوں نسخوں، نسخۂ مالک رام، نسخۂ غالب (نسخۂ خواجہ) اور نسخۂ سویدا (مکتوبہ قاضی عزّت اللہ دہلوی) میں صرف ستائیس ہیں، لیکن یہ پوری پوری ہیں۔۔۔۔ اُردو کی غزلیں ردیف وار ہیں، اگرچہ ۱۱۷ ہیں"
>
> [مقدمۂ "گل رعنا" (عابدی)، ص ۴۱]

گویا نسخۂ سویدا کے بارے میں، اس اقتباس سے یہ روشنی ملتی ہے کہ سیّد وزیر الحسن عابدی کے بقول :

> "اُردو غزلیں ردیف وار، نسخۂ سویدا میں ۱۱۷ ہیں اور فارسی غزلیں ۲۷

ہیں اور یہ پوری پوری ہیں ۔"

جبکہ عابدی صاحب ہی اپنے مقدمے میں اس سے کچھ پہلے نسخۂ سویدا کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ :

"نسخۂ سویدا کی منظومات میں جا بجا غزلیں یا بعض اشعار ساقط ہیں اور صفحات کو بیاض چھوڑ دیا گیا ہے ۔ قاضی عزت اللہ نے شروع میں خود بھی لکھ دیا ہے : " بعضی (کذا) اشعار نوشتہ شد ۔"

[مقدمۂ گلِ رعنا (عابدی)، ص ۳۴]

یہاں نسخۂ سویدا کے بارے میں اپنے مطالعے کے نتائج کو دہرانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ نسخۂ سویدا حقیقتاً "گلِ رعنا" کا کوئی مکمل مخطوطہ نہیں ہے ۔ اسے زیادہ سے زیادہ چند غزلوں پر مشتمل "گلِ رعنا" کا ایک سرسری اور مجمل انتخاب سمجھنا چاہیے ۔ نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے حصۂ اُردو کی پہلی ۵۹ غزلوں کے ۲۲۸ اشعار کے مقابلے میں نسخۂ سویدا میں صرف ۹ متفرق غزلوں کے ۱۲ شعر درج ہیں اور حصۂ فارسی میں زیادہ سے کل ۹ غزلیں ہیں ۔

مقدمے کے علاوہ اس کتاب کا ایک اہم حصہ "گلبن" یعنی تعلیقاتِ گلِ رعنا ہے ۔ لیکن یہ تعلیقات صرف حصۂ اُردو سے متعلق ہیں (صفحہ ۱۳۱ ۔ ۲۳۵) ۔ "گلِ رعنا" کے دیباچے خاتمے اور اشعارِ فارسی کو یکسر معرّیٰ چھوڑ دیا گیا ہے ۔

"گُلِ رعنا"

نسخۂ مالک رام کا زمانۂ کتابت

[۱]

"گُلِ رعنا" غالبؔ کے اُردو اور فارسی کلام کا اوّلین انتخاب ہے جسے خود غالبؔ نے بمقام کلکتہ غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری، مطابق ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء کو اپنے ایک عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ "گُل رعنا" کو غالبؔ کی زندگی میں روزِ اشاعت نصیب نہیں ہُوا۔ اُن کی وفات کے بعد بھی اسے اشاعت کا مُنہ دیکھنے میں سو برس سے اُوپر لگ گئے۔

غالبؔ صدی "گُلِ رعنا" کے مختلف نُسخوں کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں بڑی زرخیز اور یادگار ثابت ہوئی۔ ۱۹۶۹ء میں راقم الحروف نے غالبؔ دوستوں کو "گُلِ رعنا" کے دو مخطوطوں، نُسخۂ سویدا، اور نُسخۂ غالبؔ بخطِ غالب مرقومہ ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء کا پتا دیا۔[1]

مئی ۱۹۷۰ء میں مالک رام (دلّی) نے اپنے نُسخے کو جو ۱۹۵۷ء سے اُن کے پاس تھا، مرتب کر کے شائع کیا۔۔۔۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں لاہور سے "گُل رعنا" کا ایک متن شائع ہُوا جسے سیّد وزیر الحسن عابدی نے ترتیب دیا ہے۔[2]

---

[1] "۱۹۶۹ء میں جب غالبؔ کی صد سالہ برسی منائی جارہی تھی تو "گُل رعنا" کے (نُسخۂ مالک رام کے علاوہ) دو اور مخطوطوں کا علم ہُوا اور ان کا تعارف سیّد مُعین الرحمٰن نے "نقوش" کے غالبؔ نمبر، حصّہ دوم میں کرایا۔ یہ دونوں نُسخے لاہور میں ہیں ۔۔۔"
[سیّد قدرت نقوی: اُردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء بمستقل مضامین ص ۱]

[2] اس کے تفصیلی جائزے کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کا مقالہ مشمولہ:
[سہ ماہی غالب نامہ، دہلی، جلد ۱، شمارہ ۲۰۱، جنوری، اپریل ۱۹۷۷ء ص ۵۵-۸۸]

سہ ماہی اُردو، کراچی، شمارہ ۱، جنوری۔ مارچ ۱۹۷۱ء سے "گُل رعنا" کا ایک اور نسخہ قسط وار چھپنا شروع ہُوا۔ ۱۹۷۵ء میں یہ انجمن ترقی اُردو، کراچی کی جانب سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اِس نسخے کی دریافت کا سہرا مُشفق خواجہ کے سر ہے جنھوں نے اس کی ترتیب کا کام سیّد قدرت نقوی سے لیا۔

یہاں مالک رام کے مرتب کردہ نُسخۂ "گُل رعنا" پر اس کے زمانۂ کتابت کے حوالے سے اظہارِ خیال مقصود ہے۔

[۰۲]

مالک رام، اپنی سرکاری ملازمت کے دوران میں چند سے (۵۸ - ۱۹۵۶ء) مرکزی حکومتِ ہند کے شعبۂ تجارت درآمد و برآمد میں رہے ہیں، یہیں اُن کے افسرِ اعلیٰ سیّد نقی بلگرامی نے اُنھیں اپنے دادا مرحوم نواب عماد الملک[۵] کے کتاب خانے (حیدر آباد دکن) کا نسخہ تحفتاً دیا۔ یہ نسخہ "گُل رعنا" کا تھا، یعنی غالب کے اُردو، فارسی اشعار کا اوّلین انتخاب، جو ناپید ہو چکا تھا! مالک رام لکھتے ہیں :

"یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ میں اس کے چند مہینے بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں پھر مُلک سے باہر چلا گیا۔ روانگی سے قبل مَیں نے ایک مبسوط مضمون اس کے بہرۂ اُردو سے متعلق "نذرِ ذاکر" کے لیے تیار کیا جو زیرِ ترتیب تھی۔ مَیں بلجیم میں تھا کہ نیاز فتح پوری مرحوم کا خط ملا کہ "نگار" کا غالب نمبر شائع کرنا چاہتا ہوں، غالب کی فارسی تصنیفات سے متعلق ایک مضمون بھیج دو۔ مَیں نے تعمیلِ حکم میں تو مضمون لکھا ہی، لیکن از خود ایک اور مضمون "گُل رعنا" کے بہرۂ فارسی سے متعلق بھی لکھ کر انھیں بھیج دیا۔ اُنھوں نے یہ

---

[۵] نواب صاحب کے حالات میں رُجوع کیجیے چند ہم عصر مولوی عبدالحق، کراچی جولائی ۱۹۷۰ء ص ۳۸۰ - ۴۲۵

دونوں شامل اشاعت کرلیے ـــــ مَیں چھ سال بعد ۱۹۶۴ء کے وسط میں وطن واپس آیا، یہاں غالب صد سالہ یادگار منانے کی داغ بیل پڑ چکی تھی ـــــ اب مَیں نے خیال کیا کہ پوری کتاب کو ٹھیک سے مرتب کر کے شائع کر دینا چاہیے اور اس کے لیے غالب صد سالہ برسی کی یہ تقریب (۱۹۶۹ء) بہت موزوں موقع معلوم ہوا، لیکن یادگار کمیٹی کے ارباب حل و عقد کو بھی میری واپسی کی اطلاع مل گئی اور بتدریج میں اُن کے ساتھ اس تقریب کی تیاریوں اور سرگرمیوں میں اُلجھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مَیں اس موقع پر "گُلِ رعنا" شائع نہ کر سکا۔ شکر ہے کہ اب سال بھر بعد (۱۹۷۰ء میں) یہ خواہش پوری ہو رہی ہے ـــــ"

[مُقدمہ، گُلِ رعنا، صفحہ ۱۳ و بہ بعد]

"گُلِ رعنا" مرتبہ: مالک رام، علمی مجلس، دہلی سے مئی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۱۸ × ۲۲/۸ سائز کے ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کے مُندرجات اور مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مقدمہ:	مالک رام	صفحہ ۷ ـــ ۴۱
۲۔ دیباچہ:	غالب	۴۵ ـــ ۴۸
۳۔ انتخابِ کلام	غالب	
	(الف) اُردو	۵۱ ـــ ۱۰۶
	(ب) فارسی	۱۰۷ ـــ ۱۴۵
۴۔ خاتمہ:	غالب	۱۴۶ ـــ ۱۵۴
۵۔ حواشی:	مالک رام	۱۵۵ ـــ ۲۰۴
۶۔ کتابیات:		۲۰۵ ـــ ۲۰۶

مالک رام نے اپنے مقدمے میں بتایا ہے کہ: "گُلِ رعنا" کا یہ نُسخہ مکمل ہے۔ کاغذ کا

سائز ½۲۴ × ۱۴ سم ہے اور حوض کا ½۱۹ × ¾۹ سم ، کاغذ باریک ولایتی ، ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے آثار ملتے ہیں لیکن اس سے نہ کتاب کو کوئی نقصان پہنچا ہے ، نہ متن ہی کا کوئی حصہ ضائع ہوا ہے۔ پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے ، نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے۔ کاتب اگرچہ بہت خوش خط تو نہیں کہا جا سکتا ، لیکن بدخط بھی نہیں ہے غلطی بھی کم کرتا ہے ، اگرچہ اس سے بالکل عاری نہیں ہے۔ ہر جگہ تخلص ، عنوان ، ولہ وغیرہ الفاظ شنجرفی روشنائی سے لکھے ہیں۔ ہر ایک صفحے پر دو جدولیں ہیں۔ باہری جدول صفحے کے کنارے سے کچھ ہی اندر کی طرف اکہرے نیلے خط کی ہے۔ اس سے تین سم اندر حوض کے عین اردگرد جدول تین خطوں پر مشتمل ہے۔ باہر نیلا خط ہے اور اندر کی طرف شنجرفی رنگ کے دو خط ـــــ غزلوں کے درمیان کے خطوط بھی شنجرفی ہیں ، غرض کہ کتاب اچھے خاصے اہتمام سے لکھی گئی ہے۔ ہر ایک صفحے پر تیرہ سطریں ہیں۔ صفحہ ایک خالی ہے ، کتاب صفحہ ۲ سے شروع ہوئی ہے اور اس پر نمبر شمار (۱) درج ہے ، پوری کتاب ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔"

(مقدمہ ، صفحہ ۱۹)

[۳]

"صفحہ (۱) سے فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے عنوان میں صرف یہ لفظ لکھے ہیں: "لاموثر فی الوجود الا اللہ" یہ صفحہ ۷ تک چلا گیا ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ نامکمل ہے ، لکھا ہے : "محررۂ نہم شوال سنہ ۱۲ ہجری" ـــــ اب "گلِ رعنا" کا غالب کا اپنا لکھا ہوا نسخہ بھی لاہور میں دستیاب ہو گیا ہے[۴] جس کے آخر میں تاریخ "غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری" ثبت ہے جو مطابق ہے

---

[۴] تفصیل کے لیے رجوع کیجیے :

(i) اشاریۂ غالب ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ، ۱۹۶۹ء ، ص ۲۹۹ ـــــ ۳۱۰

(ii) نقوش ، لاہور ، غالب نمبر ۲ ، ۱۹۶۹ء ، ص ۳۲۷ ـــــ ۳۳۳

(iii) تفصیلی جائزہ ، مشمولہ : "نذرِ حمید احمد خان" ، مرتبہ : احمد ندیم قاسمی

۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء کے ___ گویا غالب نے اسے اپنے کلکتے میں ورود کے تقریباً آٹھ مہینے بعد مکمل کیا۔ میرے خیال میں نُسخہ زیرِ نظر کے کاتب نے دیباچے کے آخر میں وہ تاریخ دینا چاہی تھی، جب اُس نے اسے نقل کیا ہے، نہ کہ نُسخۂ منقول عنہ کی تاریخ (جو میرے نزدیک خود غالب کا لکھا ہُوا نُسخہ تھا) ___ اگر میرا قیاس دُرست ہو تو یہ زیرِ نظر نُسخہ شوال ۱۲۴۴ھ کا کتابت کردہ ہے۔ سالِ ہجری کی عدم تکمیل غالباً نتیجہ ہے کاتب کے سالِ ہجری سے ناواقفیت کا ___ وہ چاہتا تھا کہ اسے بعد کو مکمل کرلے، لیکن اِس کا اُسے موقع نہ ملا۔ ۱۲ھ کا لکھنا اور بقیہ خالی چھوڑ دینے کی اور کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی ___" [مالک رام، مُقدمہ: ص ۲۰]

نُسخۂ غالب، بخطِ غالب مرقومہ غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری اور نُسخۂ مالک رام کے سرسری تقابلی مُطالعے سے بالخصوص خاتمۂ گُلِ رعنا کے واضح عبارتی فرق کی بنا پر بالیقین یہ کہا جاسکتا ہے کہ نُسخۂ مالک رام، غالب کے خطی نُسخۂ مذکور کی نقل نہیں ہے ___

اگر بفرضِ محال مالک رام کے اس قیاس کو دُرست بھی مان لیا جائے کہ نُسخۂ منقول عنہ خود غالب کا لکھا ہوا غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری کا نُسخہ تھا، تو اس سے یہ کہاں لازم آجاتا ہے کہ زیرِ نظر نُسخہ بھی لازماً ۱۲۴۴ ہجری ہی کا نقل کردہ ہے؟ اور اگر کاتب نے اسی سال غالب کے قلمی نُسخے سے جس پر "غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری" کی تاریخ موجود ہے "گُلِ رعنا" کو نقل کیا ہے تو پھر اس کے "سالِ ہجری سے ناواقفیت" کی "توجیہ" کیا پادر ہوا نہیں ہوجاتی؟

غالب کے عہد میں ہجری سال ہی معاشرے میں رائج تھا، شوال کے مہینے، یعنی رواں سال کے دسویں مہینے تک کاتب کا معاشرے میں رائج سنہ سے ناواقف ہونا بدرجۂ آخر بھی مُشکل ہی سے قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔

"۱۲ھ" کا لکھنا اور بقیہ حصۂ اعداد خالی چھوڑ دینے کی" کاتب کے سالِ ہجری سے ناواقفیت" سے کہیں زیادہ قرینِ صواب تعبیر یہ کی گئی ہے[۵] کہ وہ سالِ رواں کے ہندسے تخلص،

---

[۵] سہ ماہی اُردو، کراچی، شمارہ ۱، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین، ص ۲۰

عنوان اور ولہٗ وغیرہ الفاظ کی طرح شنگرفی روشنائی سے لکھ کر نمایاں کرنا چاہتا ہو اور سوچا ہو کہ بعد میں لکھ دوں گا اور پھر یہ بات ذہن سے اُتر گئی ہو۔

ایک قیاس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاتب نے اسے کسی ایسے نسخے سے نقل کیا ہو جس میں تاریخ "نہم شوال ۱۲۰۰ھ" مکمل ہو اور وہ سنہ گزر چکا ہو، کاتب روانی میں "نہم شوال ۱۲۰۰ھ" تک تو لکھ گیا، لیکن یہاں پہنچ کر اُسے دھیان آیا کہ یہ سنہ تو گزر چکا —— اُس نے عمداً تاریخ کو اسی صورت میں نامکمل چھوڑ دیا کہ صاحب کتاب سے رجوع کرنے کے بعد، جو سال اُسے بتایا جائے گا، وہ لکھ دے گا —— اور بعد میں وہ پوچھنا اور یا پوچھ چکنے کے بعد لکھنا بھول گیا۔

[۴]

سید قدرت نقوی کا خیال ہے[۱] اور یہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ مالک رام کا کارِ نقل بالیقین ۱۸۳۵ء (یا اس) کے بعد عمل میں آیا، کیونکہ کاتب نے خاتمے کے بعد یہ لکھا ہے: "خاتمۂ دیوانِ فارسی"

یہ خاتمہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے لگ بھگ جب دیوانِ فارسی مرتب ہوا تو لکھا گیا اور "پنج آہنگ" جب مرتب ہوئی تو اس میں بھی "خاتمۂ گلِ رعنا" کے بعد "خاتمہ دیوانِ فارسی" نقل ہوا ہے —— اِس ضمن میں مالک رام لکھتے ہیں کہ "گلِ رعنا" کے:

"اس قلمی نسخے کے خاتمے کی نثر کے اختتام پر کاتب نے "محرّر اسد اللہ محررۂ دوم محرّم الحرام" کے الفاظ کے بعد جلی عنوان دیا ہے: "خاتمۂ دیوانِ فارسی" لیکن خاتمۂ دیوانِ فارسی کی عبارت اِس کے بعد لکھی نہیں گئی۔ اس وقت مطبوعہ کلیاتِ نثر میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت کے خاتمے کی واقعی یہی صورت ہے۔ اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ کاتب نے شاید یہ عبارت "گلِ رعنا"

---

[۱] سہ ماہی اُردو، کراچی، شمارہ ۱، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین، ص ۷۰

کے اصلی خطی نسخے سے نہیں، بلکہ کلیاتِ نثر کے کسی قلمی نسخے سے نقل کی ہو۔ یہ قیاس درست نہیں ہوگا کیونکہ "گلِ رعنا" کا متن انتخابِ اشعار تو کلیاتِ نثر کے کسی نسخے میں نہیں ملتا ایک بعید سا امکان یہ ہے کہ متن اشعار تو اس نے واقعی "گلِ رعنا" ہی سے لیا اور خاتمے کی عبارت کلیاتِ نثر کے کسی خطی یا مطبوعہ نسخے سے نقل کی اور روا روی میں "خاتمہ دیوانِ فارسی" الفاظ بھی لکھ گیا تو یہ بات بھی ماننے کی نہیں۔ آخر جب اُس نے متن "گلِ رعنا" سے لیا تھا تو نثری حصہ کیوں نا وہیں سے نقل کر لیا!" [مقدمہ، ص ۲۰]

لیکن سید قدرت نقوی کا اصرار ہے کہ مالک رام نے "یہ تمام باتیں اس لیے بیان فرمائیں کہ اُن کے زیرِ نظر نسخے کو "گلِ رعنا" کے نسخۂ بقلم غالب کی نقل اور اسی عہد کا کتابت شدہ مان لیا جائے"[۵]

اس سے قطع نظر کہ نقوی صاحب نے سوئے ظن سے کام لیا ہے اور مالک رام پر ایک طرح سے "فتورِ نیت" کا الزام دھرا ہے جسے کسی طرح بھی مناسب نہیں کہا جا سکتا، اور اس سے بچا جا سکتا تو بہت اچھا تھا، مجھے نقوی صاحب کے "حاصلِ کلام" سے بڑی حد تک اتفاق ہے وہ لکھتے ہیں :

"قابلِ غور بات یہ ہے کہ "خاتمہ دیوانِ فارسی" کے الفاظ کیوں نقل ہوئے اور کہاں سے نقل ہوئے؟ یہ تو ابھی عرض کیا ہے کہ خاتمے کی عبارت ترتیبِ دیوان کا عمل ۱۸۳۵ء میں ہوا اس لیے یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ یہ الفاظ ۱۸۳۵ء کے بعد لکھے گئے اور جہاں سے یہ کاتب نقل کر رہا تھا، وہاں یہ الفاظ موجود تھے۔ ممکن ہے "گلِ رعنا" کا کوئی ایسا نسخہ ہو جس میں خاتمۂ دیوان فارسی بھی نقل کر لیا گیا ہو اور یہ نسخہ (یعنی نسخۂ مالک رام) اس سے نقل کیا جا رہا ہو۔

---

۵ ایضاً، صفحہ ۲۰ و بہ بعد

کاتب جب اس مرحلے پر پہنچا تو اُسے نقل کرنے سے منع کر دیا گیا ہو۔ بہرحال اس نسخے میں خاتمے کی نقل (یعنی : خاتمۂ دیوانِ فارسی کے جلی عنوان کی نقل) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نُسخہ ۱۸۲۵ء کے بعد نقل کیا گیا ہے، ۱۲۴۴ ہجری (۱۸۲۸ء) میں نہیں [8]۔۔۔۔۔"

مَیں سیّد قُدرت نقوی کے نکالے ہوئے نتیجے کو اس جُزوی ترمیم کے ساتھ قابلِ قبول سمجھتا ہوں کہ نسخۂ گُلِ رعنا، مخزونہ مالک رام کی کتابت لازماً ۱۸۲۵ء کے "بعد" ہی کی نہیں؛ یہ نُسخہ ۱۸۲۵ء میں یا اس کے بعد کبھی نقل کیا گیا ہے۔" بعد، کب تک؟" اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

[۵]

زیرِ بحث نُسخۂ "گُلِ رعنا" کے بارے میں مالک رام کا مُشاہدہ ہے کہ :

"۔۔۔ پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے [9]۔"

"اس قلمی نُسخے کے خاتمے کی نثر کے اختتام پر کاتب نے ...... جلی عنوان دیا ہے : خاتمہ دیوانِ فارسی، لیکن خاتمۂ دیوان فارسی کی عبارت اس کے بعد لکھی نہیں گئی [10]۔۔۔۔"

اِس وقت مطبوعہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" میں "خاتمۂ گُلِ رعنا" کی عبارت کے خاتمے کی واقعی یہی صورت ہے۔ اس لیے گو مالک رام نے اِس امکان کو رَد کر دیا ہے، لیکن میری رائے یہی ہے کہ کاتب نے کم از کم "خاتمۂ گُلِ رعنا" کی عبارت اصلی خطّی نُسخے سے نہیں

---

[8] ایضاً، صفحہ ۲۰ و ما بعد [9] مُقدمہ "گُلِ رعنا" علمی مجلس، دہلی، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۱۹

[10] ایضاً، صفحہ ۲۰

بلکہ "پنج آہنگ" یا "کُلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی (خطی یا) مطبوعہ نسخے سے نقل کی ہے۔[۱۵]

نُسخۂ "گُلِ رعنا" بخطِ غالب (مُحررہ غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ) میں خاتمے کے بعد "مُحرّرِ دُعاگو محمد اسد اللہ" درج ہے اور "ولہ" کا عنوان دے کر اسی صفحے کے بقیہ خالی حصے سے "مثنوی بادِ مُخالف" شروع ہو جاتی ہے، نہ کہ "خاتمۂ دیوانِ فارسی" ——— گُلِ رعنا کے اصلی خطی نُسخۂ غالب (مذکور) سے نقل تیار کرنے کی صورت میں کاتب "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا عنوان قائم کرنے کے بجائے "مثنوی بادِ مخالف" کو لکھنا شروع کرتا، جبکہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کی بالکل یہی صورت ہے کہ "خاتمۂ گُلِ رعنا" کے ختم ہوتے ہی "خاتمۂ دیوانِ فارسی" شروع ہو جاتا ہے

بالفعل میرے پیشِ نظر "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کے مطبوعہ نُسخے ہیں "پنج آہنگ" کا وہ نُسخہ جو غالب کی زندگی میں دوسری بار دہلی سے اپریل ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کا پہلا ایڈیشن جو مطبع نولکشور، لکھنؤ سے غالب کی زندگی میں جنوری ۱۸۶۸ء میں چھپا۔ "پنج آہنگ" میں "خاتمۂ گُلِ رعنا" صفحہ ۱۴۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۵۶ کی تیسری سطر پر ختم ہوتا ہے اسی سطر سے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا جلی عنوان قائم کر کے، چوتھی سطر سے دیوانِ فارسی کے خاتمے کی عبارت شروع ہو جاتی ہے ——— یعنی تیسری سطر کی بقیہ خالی جگہ میں بقلمِ جلی "خاتمۂ دیوان" کا ٹکڑا آیا ہے اور چوتھی سطر کا پہلا لفظ بخطِ جلی "فارسی" ہے۔

"پنج آہنگ" مطبوعہ ۱۸۵۳ء کے صفحہ ۱۵۶ کی پہلی چار سطروں کی ہو بہو نقل مُلاحظہ ہو:

---

[۱۵] سیّد قُدرت نقوی نے مالک رام کی اس رائے کے ایک حصّے سے اتفاق اور ایک سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ تو ہمیں بھی تسلیم ہے کہ خاتمہ (یعنی خاتمۂ گُلِ رعنا) کُلیات (یعنی کلیاتِ نثرِ غالب) سے نقل نہیں ہُوا۔ لیکن جہاں سے نقل ہوا، وہ نسخہ بقلمِ غالب نہیں تھا ———"

[اُردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین، ص ۲۱]

مجھے نقوی صاحب کی رائے کے پہلے جُزو سے اختلاف اور دوسرے سے اتفاق ہے۔ میرے نزدیک نسخۂ مالک رام میں خاتمۂ گُلِ رعنا کی عبارت "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے نقل ہوئی ہے اور اسے مان لیا جائے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ نُسخۂ مالک رام کے خاتمے کی عبارت کاتب نے "گُلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخے بقلمِ غالب سے نقل نہیں کی۔

۱۵۶

پہلی سطر:	مدار المہام والاہم را عمر دوام اساس وامر عالم مطاع
دوسری سطر:	وحکم عدو مال و دل آسودہ وطالع مسعود عطا دارد محرر
تیسری سطر:	اسد اللہ محررہ دوم محرم الحرام خاتمہ دیوان
چوتھی سطر:	فارسی یزداں را کہ سخن آفرید و زبانرا بزنگا رنگ

"کلیاتِ نثرِ غالب" (جنوری ۱۸۶۸ء) کی بھی یہی صورت ہے۔ اس میں صفحہ ۲۹ سے "خاتمۂ گلِ رعنا" کا آغاز ہوا ہے (صفحہ ۲۹ پر "خاتمے" کی کُل دس سطریں آئی ہیں) اور صفحہ ۳۲ کی پندرہویں سطر پر یہ تمام ہوا ہے۔ بابعد اس سے بالکل متصل "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا عنوان نسبتاً جلی قلم سے ہے۔ یہاں "کلیاتِ نثرِ غالب" کے صفحہ ۳۲ سے "خاتمۂ گلِ رعنا کی سطر ۱۴، ۱۵ اور جلی عنوان" خاتمۂ دیوانِ فارسی" پر مشتمل سطر ۱۶ کی "نقل" پیش کی جاتی ہے:

سطر ۱۴	وصمد العلام سرو سرگروہ اہلِ کرم عمدۂ اُمرار والاہم ..... طالع مسعود عطا دارد محرّر		
سطر ۱۵:		أسدُ اللہ مُحرّرہ دوم محرم الحرام	
سطر ۱۶:		خاتمہ دیوانِ فارسے	

یہ صوری مشابہت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نسخۂ مالک رام کے کاتب نے "گلِ رعنا" کے خاتمے کی عبارت "گلِ رعنا" کے اصلی خطّی نسخے نوشتۂ غالب (غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری) سے نہیں، بلکہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی مطبوعہ (یا خطّی) نسخے سے نقل کی ہے ــــــ اور چونکہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کے مابعد "خاتمۂ دیوانِ فارسی" آیا ہے، اس لیے کاتب رواروی میں "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کے الفاظ بھی لکھ گیا ــــــ

مدار المهام والاهم را عمر دوام اساس دامر عالم مطاع
وحکم عدد مال و دل آسوده وطالع مسعود عطا دارد محرر
اسد الله محرره دوم محرم الحرام **خاتمه دیوان**
فارسی یزدان را که سخن آفرید و زبانرا برنگارنگ
شیوه گویا کرد جهان جهان نیایش در ورزگار را
که در نگارش ستوده رودشتی پیشین آورد و نگارندگانرا
بنوای کلکم سرخوش نشاط جاوید ساخت هزار آفرین
و پیشینه رهروان فراخنای سخن را که بسر منزل اینکنار
پا افزار از پای کشیده و بند از کمر کشاده بسایه
نخلهای فراوان برگ آرمیده بارگی را انجا سر داده
انداز من که واپسی این فرو چیده کاروان و گزین
بادیه نوردان راز دنباله روانم فراوان درود با دهانا
گرایش اندیشه بنوا سنجی این پوزش درخواه فیضان همت
ست و کدیهٔ اثرهای قبول که به تنومندی آن معنوی
نبرد

["پنج آہنگ" طبع دوم دہلی ۱۸۵۳ء کے صفحہ ۱۵۰ کا عکس۔]

[۶]

اس صوری مشابہت سے قطع نظر بھی، بوجوہ میری رائے یہی ہے کہ نسخۂ مالک رام کے کاتب نے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت اصل خطّی نسخے سے نہیں بلکہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی (خطّی یا) مطبوعہ نسخے سے نقل کی ہے۔ "گلِ رعنا" کے اصل خطّی نسخے نوشتۂ غالب (مذکور) سے تو اس لیے نہیں کہ اس میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی شکل بجنسہٖ وہ نہیں ہے جو مالک رام کے نسخے میں صورت پذیر ہوئی ہے اور "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی مطبوعہ (یا خطّی) نسخے سے اس لیے کہ نسخۂ مالک رام کے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت، ــــــ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" میں شامل "خاتمۂ گلِ رعنا" کے مطبوعہ متن سے حرف بحرف مطابقت رکھتی ہے۔ مثلاً "خاتمۂ گلِ رعنا" (نسخۂ مالک رام) کی آخری سطور یہ ہیں :

"...... طبع مرہم دارد کہ گرد کسادِ حالِ مرا درہم دارد ۔ ماموں کہ سرکارِ والا بحرِ ملال و گوہر کمال مرا در سلک مطالعہ در آوردہ اصلاحِ حال صلہ دہد؛ مگر دلِ گرہ در گرہ دامِ مدعا گردد کہ سہا ہم طالع ماہ و مگس ہمسر ہما گردد۔ احکم الحکام و صمد العلام سرورِ سرکردۂ اہلِ کرم عمدۃ امراء ، مدار المہام والا ہمم را عمرِ دوام اساس و امرِ عالم مطاع و حکمِ عدو مال و دلِ آسودہ و طالع مسعود عطا دارد ۔ ط محرر اسد اللہ ۔ محررۂ دوم محرم الحرام ــــــ"
(صفحہ : ۱۵۳)

"پنج آہنگ" (دہلی، اپریل ۱۸۵۳ء) اور "کلیاتِ نثرِ غالب" (لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء) کے جو مطبوعہ نسخے میرے پیشِ نظر ہیں، ان میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی ان آخری سطور کا متن بالکل یہی ہے[۱۲]

---

[۱۲] سوائے اس خفی فرق کے ساتھ کہ "پنج آہنگ" (۱۸۵۳ء) کی آخری سطر میں "عطا دارد" کے بعد لفظ "فقط" کی مخفف صورت "ط" محذوف ہے جو چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔

جبکہ "گلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخے مرقومہ غالب دعزہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری)، متعارفہ راقم الحروف میں خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت کی آخری سطور کا متن نسخہ مالک رام کے مقابلے میں یہ ہے :

"...... طبع مرہم دارد کہ گرد ملال حال مرا درہم و دل کم حوصلہ درد مرا رسوا در عالم کردہ احکم الحکام وصمصام العلام سرو سر کردۂ اہل کرم عمدۂ اُمراء مدار المہام والا ہمم رائے رادوام اساس و امر عالم مطاع و حکم عدو کاہ و دل آسودہ و طالع مسعود عطا دارد۔

محرر دُعا گو محمد اسد اللہ[۳۳]

متن کے اس قدر نمایاں اور بُنیادی اختلاف سے میرے اس موقف کی دستاویزی تائید ہوتی ہے کہ نُسخۂ مالک رام کے خاتمے کی عبارت "گلِ رعنا" کے اصلی نُسخے نوشتۂ غالب دعزہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری کی نقل نہیں ہے۔

اس توضیح و تجزیے کے بعد مالک رام کی یہ رائے قابلِ قبول نہیں ٹھہرتی کہ اُن کا مخزونہ نسخۂ گلِ رعنا" : خود غالب کے لکھے ہوئے نُسخے کی نقل اور شوال ۱۲۴۴ ہجری (۱۸۲۸ء) کا کتابت کردہ ہے ——" (مُقدمہ، گلِ رعنا، ص ۲۰)

[۷]

میرے نزدیک یہ نُسخہ بوجوہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے بعد ۱۸۸۲ء تک کے زمانے میں کبھی نقل ہُوا ہے —— دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ نُسخۂ مالک رام کی کتابت کا زمانہ ۱۲۵۱ ہجری (۱۸۳۵ء) سے لے کر حد سے حد ۱۲۹۹ ہجری (۱۸۸۲ء) تک کی مدت پر محیط ہو سکتا ہے —— اور یہ سلسلہ ۱۸۳۵ء یا اس کے بعد سے ۱۸۸۲ء تک جن سنین سے ہو کر

---

[۳۳] عکس تحریر در :
(۱) اشاریۂ غالب، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۳۰۶
(۲) نقوش، لاہور، غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۳۳۳

گزرتا ہے، وہ یہ ہیں: ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۷ء، ۱۸۴۵ء، ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۳ء، ۱۸۶۹ء، ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء اور تا بہ امکان، حدِ آخر ۱۸۸۲ء ——— ان مراحل یا منازل کا تعیین اس طرح ہوتا ہے:

۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء

اس سال غالب "دیوان فارسی کو "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے مکمل و مرتب کر کے اس پر دیباچے اور خاتمے کی فارسی نثر لکھ چکے تھے۔ "پنج آہنگ" کے دیباچے میں علی بخش نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ نسخۂ مالک رام میں خاتمے کی نثر کے بعد کاتب نے "خاتمۂ دیوان فارسی" کا جلی عنوان دیا ہے، گو خاتمۂ دیوانِ فارسی کی عبارت اس کے بعد لکھی نہیں گئی ——— بہرحال "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کے جلی عنوان کی نقل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخۂ مالک رام، کم سے کم خاتمۂ دیوانِ فارسی کے سالِ ارقام یعنی ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں یا اس کے بعد کبھی لکھا گیا۔

۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء

دیوانِ فارسی، غالب، طبع اوّل (۱۸۴۵ء) کے مطابق "خاتمۂ دیوان فارسی" کی عبارت غالب نے اکتالیس برس (سال چہل و یکم) کی عمر میں یک ہزار دو صد و پنجاہ و سہ سال ہجری (۱۲۵۳ھ) مطابق ۱۸۳۷ء میں لکھی۔ اگر اس پر انحصار کیا جائے تو نسخۂ مالک رام کا ۱۸۳۷ء یا اس کے بعد لکھا جانا قیاس کیا جائے گا۔

۱۸۴۵ء

غالب کا "دیوانِ فارسی" جسے علی بخش نے "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے ۱۸۳۵ء

میں تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود" بتایا ہے اور جسے خود غالب نے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" میں ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۷ء) میں مُرتّب کرنا لکھا ہے، پہلی بار مطبع دار السلام، دہلی سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا ——— ممکن ہے نُسخۂ مالک رام کے کاتب نے مطبوعہ دیوان سے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کو پہلی بار دیکھا ہو اور اسے نقل کرنا چاہا ہو، اس صورت میں نُسخۂ مالک رام کی کتابت کا زمانہ ۱۸۴۵ء یا اس کے بعد کا مانا جائے گا۔

۱۸۴۹ء، ۱۸۵۳ء

"پنج آہنگ" کی اشاعت، غالب کی زندگی میں پہلی بار، اگست ۱۸۴۹ء، اور دوسری بار اپریل ۱۸۵۳ء میں روبہ عمل آئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے "آہنگِ چہارم" میں "خاتمۂ گُلِ رعنا" شامل ہے اور اس کا متن اور 'آہنگِ چہارم' میں اس کا "محلِ وقوع" نُسخۂ مالک رام کے عین مطابق ہے، یعنی "خاتمۂ گُلِ رعنا" کی عبارت ختم ہوتے ہی فوراً بعد "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کی سُرخی اور عبارت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نُسخۂ مالک رام کے کاتب کے پیشِ نظر "پنج آہنگ" کا کوئی قدیم خطّی نُسخہ نہیں تھا، تو پھر اُس نے "خاتمۂ گُلِ رعنا" کی عبارت "پنج آہنگ" مطبوعہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۳ء سے نقل کی ہے۔ اس صورت میں نُسخۂ مالک رام کی کتابت کا زمانہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۳ء یا ان سنین کے مابعد کا مانا جائے گا۔

۱۸۶۸ء، ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵

"کلیاتِ نثرِ غالب" پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا، جو "پنج آہنگ" —"مہرِ نیم روز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی "خاتمۂ گُلِ رعنا" کے متن اور محلِ اشاعت کی وہی کیفیت ہے جو "پنج آہنگ" کے ضمن میں بیان ہوئی ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ نُسخۂ مالک رام کے کاتب کے سامنے "کلیاتِ نثرِ غالب" کا کوئی پُرانا خطّی نُسخہ نہیں تھا تو پھر اُس نے "خاتمۂ

گُلِ رعنا" کی فارسی نثر "کُلیاتِ نثرِ غالب" مطبوعہ ۱۸۶۸ء یا اس کی مابعد اشاعتوں، طبع دوم، نولکشور، لکھنؤ ۱۸۷۱ء، طبع سوم، نولکشور، کانپور ۱۸۷۵ء میں سے کسی ایک سے نقل کی ہے:

حدِ آخر ۱۸۸۲ء

۱۸۸۲ء کو میں نسخۂ مالک رام کی کتابت کا تا بہ حدِ امکان، سالِ آخر اس بنا پر قرار دیتا ہوں کہ نسخۂ مالک رام میں مندرج نامکمل تاریخ کی شکل یہ بتائی گئی ہے:

"محررہ نہم شوال ۱۲ھ ہجری"

اگر "۱۲ھ" کی قرأت صحیح ہوئی ہے، یعنی یہ سنہ "۱۲" (بارہ) ہی ہے "۱۳" (تیرہ) نہیں، تو سنہ بارہ سو ہجری کی حدِ آخر ۳۰، ذی الحجہ ۱۲۹۹ء مطابق ہوتی ہے ۱۱، نومبر ۱۸۸۲ء کے ——— اس طرح "گُلِ رعنا" کے نسخۂ مالک رام کی کتابت، مالک رام کے قیاس (شوال ۱۲۴۴ھ / مئی ۱۸۲۹ء) کے بجائے، میرے نزدیک ۱۸۲۵ء میں یا اس کے بعد زیادہ سے زیادہ ۳۰، ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ / ۱۱، نومبر ۱۸۸۲ء تک کے زمانے میں کسی وقت عمل میں آئی ہے۔

تلاش و تعین

حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین
اور ان سے نتائج کا استخراج ادبی تحقیق کا مقصود ہے یا
ہونا چاہیے۔

——— رشید حسن خاں

غالبؔ کے بعد اُن پر پہلا مضمون

[۱]

"مرزا غالبؔ پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔" —— بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

گزشتہ پچیس تیس برس میں غالبؔ پر جتنی قابلِ قدر تصانیف ہمارے سامنے آئیں اُردو کے اور کسی مُصنّف یا شاعر کے حصّے میں نہ آئیں —— " رشید احمد صدیقی

جتنی اچھی اور اُونچے درجے کی کتابیں غالبؔ کی زندگی اور شاعری پر لکھی گئیں. اتنی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئیں —— ڈاکٹر سیّد عابد حسین

اُردو میں غالبؔ پر جتنا زیادہ لکھا گیا ہے، اتنا باستثنائے اقبالؔ، کسی اور ادیب (اور شاعر) پر نہیں لکھا گیا" —— ڈاکٹر گیان چند

غالبؔ ہمارے ادب کی اُن محبوب شخصیتوں میں سے ہیں جن کے متعلق ایک دو

کتابیں نہیں بلکہ کتاب خانے تیار (ہوئے اور) ہوں گے ــــــ"

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

"غالب کو ہمارے ادب میں اتنی اہمیت حاصل ہے اور شیفتہ، آزاد، حالی سے آج تک، اس کثرت سے ہمارے اہلِ قلم نے اس مقبول موضوع پر طبع آزمائی کی ہے کہ اردو ادب کے گوناگوں رجحانات اور بالخصوص ہمارے فنِ تنقید کے ارتقار کا پورا اندازہ اُن کتب کے مطالعے سے ہو سکتا ہے جو غالب کے متعلق لکھی گئیں ــــــ"۔ ــــــ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

"غالبیات" کی اس کثرت میں غالب پر پہلے مضمون کی تلاش و تعیین آسان نہیں ہے، اس لیے کہ غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے وہ سب کا سب کہیں یک جا موجود نہیں اور اس سے بھی بڑھ کر "علّت" یہ کہ قدیم مجلّے، تذکرے، گلدستے، بیاضیں اور اخبارات و رسائل وغیرہ کے پورے فائل محفوظ بھی نہیں ہیں۔

غالب نے قریب بہتّر برس کی عمر پائی۔ انھیں شعرار کے تذکروں میں اُس وقت سے جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی جب وہ ابھی پندرہ سولہ برس کے تھے[۱] لیکن اپنے عینِ حیات اُن پر جو کچھ لکھا گیا، اُس سے قطع نظر یہاں محض اُن نگارشات سے بحث ہے جو اُن کی وفات کے بعد سامنے آئیں۔

---

[۱] خوب چند ذکا کے تذکرے "عیار الشعرا" میں جس کا اوّلین مسودہ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء اور ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۲ء کے درمیان ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول ہر طرح مکمل ہو گیا تھا ("اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۲) غالب کا تذکرہ اور انتخابِ اشعار شامل ہے۔ اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور کے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" میں بھی جس کا سالِ آغاز و انجام ۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۲ء بتایا گیا ہے، غالب کا ذکر اور غالب کے اشعار کا انتخاب شامل ہے، اُس وقت تک غالب اکبر آباد میں مقیم تھے اور اُن کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے "غالب کے بارے میں پہلا مضمون؟" کے تحت ماہنامہ ذخیرہ بالگو بند، آگرہ، بابت مارچ ۱۸۶۹ء کے ایک مضمون "مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب رُو نوشہ" کے بارے میں جو منشی بالگو بند ماتھر کا لکھا ہوا ہے، غیر یقینی انداز میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ:

"غالباً مرزا کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا[۲]۔"

گارسین دتاسی نے "تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی"[۳] (طبع دوم، جلد اوّل، پیرس ۱۸۷۰ء) میں غالب کا تذکرہ قلمبند کرتے ہوئے (صفحہ ۴۸۴ و مابعد)، دو مضامین کا حوالہ دیا ہے جو غالب کی وفات پر ۱۶ مارچ اور ۲۳ مارچ[۴] ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ اودھ اخبار، لکھنؤ کے یہ پرچے اب دستیاب نہیں۔ آغا افتخار حسین نے اپنے ایک قیمتی مضمون "یورپ میں غالب کا مطالعہ" میں ان دونوں نایاب مضامین کے فرانسیسی ترجموں کی تلخیص اُردو زبان میں پیش کر دی ہے[۵]۔

محمد عتیق صدیقی نے "غالب پر پہلا اہم مضمون" کے تحت ہفتہ وار "رتن پرکاش" (ز کلام

---

[۲] احوالِ غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۹

[۳] فرانسیسی زبان میں تین جلدوں پر مشتمل اس تاریخ کا تنقیدی حواشی اور مقدمے کے ساتھ اُردو ترجمہ کر کے ایک فرانسیسی خاتون لیلیان نذرو نے ۱۹۶۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ترجمہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (کراچی) کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے (نگار، کراچی، تذکروں کا تذکرہ نمبر، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۷)

[۴] ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء کے "اودھ اخبار" میں غالب پر جو مضمون درج تھا، اُسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ضروری تمہید کے ساتھ لیلیان نذرو کے ترجمے (مخزونہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) کے حوالے سے قومی زبان، کراچی دسمبر ۱۹۶۸ء (صفحہ ۵ — ۸) میں شائع کر دیا ہے۔ اب یہ اُن کی کتاب: "غالب — شاعر امروز و فردا" مطبوعہ ۱۹۷۰ء (ص ۳۰۳ — ۲۰۹) میں بھی شامل ہے۔

[۵] مضمون: "یورپ میں غالب کا مطالعہ" مشمولہ:

(ا) افکار، کراچی، فروری مارچ ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۰ — ۱۰۳

(اا) یورپ میں تحقیقی مطالعے، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۲۴۹ — ۲۶۳

بند میل کھنڈ) کی اشاعت ۵، مارچ ۱۸۶۹ء کے ایک مضمون کی نشاندہی کی ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کے حوالے سے مولانا محمد حسین آزاد کے ایک مضمون "وفات اسد اللہ خاں" مطبوعہ سرکاری اخبار، لاہور ۲۴ فروری ۱۸۶۹ء کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے غالب پر :

معاصر مضامین میں تاریخِ اشاعت کے لحاظ سے تو پہلا نہیں کہا جا سکتا مگر مواد کے لحاظ سے اوّلیت کا درجہ حاصل ہونے میں کوئی شک نہیں[۲]۔۔۔۔"

[۲]

یہاں ضروری تمہید اور تعارف کے بعد اکمل الاخبار، دہلی کی اشاعت ۱۷، فروری ۱۸۶۹ء سے ایک مضمون پیش کیا جاتا ہے جسے مُتذکرہ بالا سب مضامین پر زمانی تقدّم حاصل ہے اور جسے اب تک کی تحقیق کے مُطابق غالب کے بعد اُن کے حالات میں پہلا مضمون خیال کرنا چاہیے:

ہفت روزہ "اکمل الاخبار" دہلی، محلہ بلیماراں دیوان خانہ حکیم محمود خاں سے یکم جنوری[۳] ۱۸۶۶ء کو جاری ہوا۔ اکمل الاخبار کے پہلے صفحے پر مُستقلاً اخبار کا اشتہار درج ہوتا تھا جس کی ابتدائی سطور یہ ہیں :

"یہ اخبار راستی آثار ہفتہ وار ہر چار شنبہ کو منطبع ہو کر خدمت میں شائقین کے بھیجا جاتا ہے۔ رئیسان ذوی الاحترام بلکہ خاص و عام کو پسند آتا ہے۔ رفاہِ عام پر نظر ہے۔۔۔"

مولانا امداد صابری نے "اکمل الاخبار" کی وجۂ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ :

حکیم غلام رضا خاں صاحب، حکیم غلام نبی، حکیم محمود خاں اور میر فخر الدین صاحب

---

[۱] آج کل، دہلی، فروری ۱۹۶۲ء، ص ۲۷ - ۳۲

[۲] اَدبی دُنیا، لاہور، ۱۹۶۴ء، شمارہ دوازدہم، ص ۷۷

[۳] امداد صابری، تاریخِ صحافت اُردو، جلد دوم، طبع اوّل، دہلی، ص ۲۱۸

کے آپس میں بہت گہرے تعلقات تھے۔ ان کا مشورہ ہوا کہ ایک اخبار نکالا جائے جس کے لیے پریس کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اخبار اور پریس کے نام پر غور ہوا تو یہ طے پایا کہ اپنے جدِ امجد حکیم شریف خاں صاحب کے والدِ ماجد اکمل خاں کے نام پر اخبار جاری کیا جائے اور پریس کھولا جائے چنانچہ ۱۸۶۶ء میں پریس اور اخبار جاری ہوئے۔ مطبع اور اخبار کے کرتا دھرتا مہتمم میر فخر الدین صاحب اور نگران بقایا حضرات مقرر ہوئے[۹]۔"

اخبار کے مالک و مہتمم میر فخر الدین اور اخبار کے دیگر منصرمین سے غالب کے عزت اور محبت کے مراسم تھے۔ غالب اس اخبار کی قلمی سرپرستی میں مستعد رہے[۱۰]۔ اس کے لیے خریدار فراہم کرنے کی فکر کی[۱۱]، اور طرح طرح سے اس کے ادارۂ تحریر کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ۷، جون ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں اپنے ایک شاگرد بہاری لال مشتاق کو جو "اکمل الاخبار" سے وابستہ تھے، لکھتے ہیں:

"برخوردار بہاری لال! ..... اس نونہالِ باغِ دولت یعنی حکیم غلام رضا خاں کے دوامِ صحبت کو اپنے طالع کی یاوری سمجھو۔ یہ دانش مند ستودہ خوی امیر ہونے والا اور مراتب اعلیٰ کو پہنچنے والا ہے۔ اس کی ترقی کے ضمن میں تمھاری بھی ترقی ہونے والی ہے..... میاں! سچ تو یوں ہے کہ اکمل المطابع، اجمل المطابع بھی ہے۔ حکیم غلام نبی خاں من جملہ خوبانِ روزگار ہیں، نکوخوی اور نکو کردار ہیں۔ میر فخر الدین آزاد منش اور سعادت مند نوجوان ہیں، کم گفتار اور مرنج و مرنجان ہیں۔ تم چاروں شخص پیکرِ صدق و صفا اور مہر و ولا کے چار عنصر

---

۹ ایضاً، ص ۲۱۸، ۲۱۹

۱۰ دیکھیے میاں داد خاں سیاح کے نام غالب کے خطوط مورخہ: ۱۹، اپریل ۱۸۶۷ء، نیز: ۲۵، اگست ۱۸۶۷ء، و اکمل الاخبار، اکتوبر ۱۸۶۸ء

۱۱ دیکھیے میاں داد خاں سیاح کے نام غالب کا خط مورخہ ۲۲، مارچ ۱۸۶۸ء

ہو، جہاں آفرین تم چاروں صاحبوں کو خوشنود و دل شاد اور اکمل المطابع کو بارونق اور آباد رکھے[۴۱]۔“

”اکمل الاخبار“ میں غالب کا نام اور احوال ہمیشہ تفصیل اور تکریم سے درج ہوتا رہا۔ چنانچہ ”بُرہانِ قاطع“ کے قضیے میں بھی اس اخبار نے غالب کی حمایت میں بڑی سرگرمی[۴۲] دکھائی اور ان کے موقف کو شد و مد سے پیش کیا۔

غالب اور اصحابِ ”اکمل الاخبار“ کے مابین تعلقِ خاطر کے رشتے اور نتیجے میں غالب کے انتقال کے فوراً بعد چہار شنبہ ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کو جو پرچہ منصۂ شہود پر آیا، اُس میں پورے ایک صفحے پر دو کالم میں سیاہ حاشیے کے ساتھ غالب پر، غالب کے انتہائی محبوب شاگرد میر مہدی مجروح کے قلم سے ایک تعزیتی مضمون شائع ہوا[۴۳] جس کا عنوان ہے:

”فخرِ عُرفی و رشکِ طالب مُرد
اَسَدُ اللہ خاں غالب مُرد

---

[۴۱] اُردوئے معلیٰ، طبع اوّل: اکمل المطابع، دہلی، ۶ مارچ ۱۸۶۹ء، ص ۴۵۸
[۴۲] تاریخ صحافتِ اُردو، امداد صابری، جلد دوم، ص ۲۲۰
[۴۳] ۱۷ فروری کے بعد اگلے چہار شنبہ ۲۴ فروری ۱۸۶۹ء کے ”اکمل الاخبار“ میں مرزا ہرگوپال تفتہ، مرزا قربان علی سالک اور سجاد مرزا کے قطعاتِ تاریخ وفات شائع ہوئے ہیں اور ان کے بعد صاحب اکمل الاخبار نے یہ نوٹ دیا ہے:

”واضح ہو کر مولای غالب مرحوم کے تلامذہ نے بہت سی تاریخیں اور مرثیے اس غم و الم میں لکھ کر برہنا اندراج اخبار، مطبع میں بھیجے ہیں، چونکہ ایک بار بسبب عدم گنجائش اخبار، وہ ذخیرہ مرقوم نہیں ہو سکتا، لہٰذا ہر پرچے میں دو چار قطعے درج ہوا کریں گے۔“

(اکمل الاخبار، دہلی، جلد ۳، نمبر ۸، ۲۴ فروری ۱۸۶۹ء، چہار شنبہ، ۱۱ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ، ص ۶۳)۔

قطعاتِ تاریخ اور مراثی وغیرہ کے اندراج کا یہ سلسلہ پانچ چھ مہینے تک جاری رہا۔ ۳ مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں میر مہدی مجروح کے سات، یوسف علی خاں عزیز کے پانچ اور تفتہ، ماسٹر وزیر سنگھ، شمس الدین شمس اور عبدالغفور نساخ کا ایک ایک قطعہ تاریخ شاملِ اشاعت ہے۔ اسی پرچے میں قربان علی بیگ سالک کا اُردو نوحہ بھی شائع ہوا ہے۔ ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء کے اخبار میں علائی، جواہر سنگھ جوہر، احمد حسن خاں اور وزیر سنگھ کے قطعات اور ۱۷ مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں حالی اور بہاری لال مشتاق وغیرہ کے قطعاتِ تاریخ شائع ہوئے ہیں۔

قیاسِ غالب ہے کہ غالبؔ کے انتقال کے بعد اس مضمون سے پہلے اور کوئی تحریر نہ چھپی ہوگی۔ اس سے غالب کے مرض الموت اور وصال کے صحیح وقت پر روشنی پڑتی ہے اور اس لیے اب ایک سو گیارہ [۱۱۱] برس پہلے کی اس تاریخی دستاویز کو من و عن پیش کرنے اور محفوظ کرلینے کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں!

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنے ایک مقالے "اب سے آدھی صدی پہلے کے اُردو اخبار" میں "اکمل الاخبار" کا ذکر کرتے ہوئے، ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کے پرچے سے غالب کی رحلت کی خبر درج کی ہے[۱۵] اور مجروح کے زیرِ بحث مضمون کو "مراسلہ" بتایا ہے۔ مالک رام نے بحوالہ کیفی اس "مراسلے" سے استفادہ کیا ہے[۱۶]۔ محمد عتیق صدیقی نے اپنے ایک مضمون[۱۷] میں ضمناً اکمل الاخبار کے اس مضمون کا ذکر کیا ہے اور اس کے چند سطری اقتباس بھی دیئے ہیں۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے عتیق صدیقی کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں ان اقتباسات کو نقل کر دیا ہے[۱۸]۔ مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب[۱۹] میں اکمل الاخبار کے اس مضمون کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے کچھ اجزا درج کیے ہیں، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مولانا امداد صابری کے حوالے سے ان اجزا کو اپنے ایک مضمون[۲۰] میں چھاپا ہے ——

یہاں، یہ پورا مضمون، جو غالبؔ کے حوالے سے ایک تاریخی حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے، پہلی بار اکمل الاخبار، دہلی، شمارہ ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء سے بجنسہٖ پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ مضمون درج کرنے سے پہلے صاحبِ مضمون میر مہدی مجروحؔ کے بارے میں کچھ باتیں بے محل نہ ہوں گی ——

---

[۱۵] اُردو، اورنگ آباد، اپریل ۱۹۲۵ء، صفحہ ۲۳۶، ۲۴۷

[۱۶] ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۱۶۶ و ۱۶۸

[۱۷] غالب کا ذکر اُن کے معاصر اخبارات میں، ماہِ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۱۲، ۱۳

[۱۸] غم نامۂ غالب، اَدبی دنیا، لاہور، ۱۹۶۴ء، شمارہ دوازدہم، ص ۷۷

[۱۹] تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد دوم، ص ۲۳۴، ۲۳۵

[۲۰] غالب اور اُن کی ہم عصر صحافت، صحیفہ، لاہور، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۵، ۱۲۶

[۳]

میر مہدی حسین مجروح دہلوی (۱۸۳۳ء — ۱۹۰۲ء)، ذکار دہلوی[۱۲] کے بیٹے اور غالب کے بڑے چہیتے شاگرد تھے۔ نظم و نثر دونوں میں قدرت رکھتے تھے۔ "مظہر معانی" کے نام سے ۱۸۹۹ء میں اُن کا دیوان پہلی بار شائع ہوا۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ مجروح نے :

"دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرتِ رسول کریمؐ کے معجزات کے بیان میں "انوار الاعجاز" اور دوسرا آئمہ کے بیان میں "ہدیۃ الآئمہ" دونوں اب کمیاب ہیں۔ ایک تذکرہ بھی "طلسم راز" لکھا تھا۔ یہ بھی اب نایاب ہے۔ اس پر غالب نے جو تقریظ فارسی میں لکھی تھی، وہ اُن کی کلیاتِ نثر میں موجود ہے۔"

[تلامذۂ غالب، طبع اوّل، ص ۲۵۳]

"تاریخ گنج عزائب" (۱۲۸۶ھ=۱۸۶۹ء – ۱۸۷۰ء) بھی مجروح سے منسوب ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔ "اُردوئے معلّیٰ" (۱۸۶۹ء) کا دیباچہ بھی مجروح کا لکھا ہُوا ہے۔ غالب نے اپنے ایک سے زیادہ خطوں میں مجروح کے اُردو عبارت لکھنے کے ڈھنگ کی داد دی ہے اور اس پر رشک کیا ہے اور یہ بہت بڑی سند ہے، اس بات کی کہ مجروح کو نثر لکھنے میں خاص قدرت اور مہارت تھی۔

"اُردوئے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" (۱۸۶۸ء) میں مجروح کے نام غالب کے پچاس کے لگ بھگ خط شامل ہیں اور ابھی بہت سے خط سامنے نہیں آئے۔ غالب کے نام مجروح کے خطوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔ اس سلسلے کے کچھ مکاتیب اور تفاصیل کے لیے رجوع کیجیے، مضامین :

---

[۱۲] ذکار دہلوی کے سلسلے میں دیکھیے :
ذکار دہلوی (حالات و انتخاب کلام)، مُرتبہ : محمد اکرام چغتائی
طبع اوّل : کتابیات، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱. مولوی عبدالحق، غالب و مجروح کی مکاتبت، الناظر لکھنؤ یکم مئی ۱۹۱۴ء

۲. مہیش پرشاد، خطوط بنام غالب مع جوابات، اردو ادب، علی گڑھ، جنوری اپریل ۱۹۵۱ء

۳. فاضل زیدی، نامۂ مجروح بنام غالب، طوفان، نواب شاہ، فروری ۱۹۵۲ء

۴. آفاق حسین آفاق، مکتوباتِ غالب و مجروح، ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۵ء

میر مہدی حسین مجروح نے ۱۵ مئی ۱۹۰۲ء (۷ صفر ۱۳۲۲ھ) بروز جمعہ وفات پائی[۴۲]

مئی ۱۹۰۲ء ہی کے رسالہ "مخزن" لاہور میں "وفات میر مہدی مجروح" کے عنوان سے مدیر "مخزن" سر شیخ عبدالقادر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جو ادبی رسائل میں مجروح کے انتقال پر میرے نزدیک پہلا مضمون ہے ـــــ یہاں اس تاریخی اور ادبی اہمیت کے حامل مضمون کو نقل کر کے مجروح کے اس تذکرے کو ختم کرتا ہوں:[۴۳]

"وفات میر مہدی مجروح"

○

"کوئی شخص جو میر مہدی مجروح کے کلام سے آشنا ہے یا جس نے غالب مرحوم کے اس لائق شاگرد کا نام سنا ہے، اس خبر کو بغیر قلق کے نہ سن سکے گا کہ اس مہینے میں میر مہدی اس جہان سے اٹھ گئے۔ غالب، شاگردوں کے معاملے میں خوش قسمت تھا۔ اسے شاگرد کیا ملتے تھے،

---

[۴۲] تلامذۂ غالب، مالک رام، ص ۲۵۳

[۴۳] مجروح کے حالات میں بعض دیگر مآخذ کے لیے رجوع کیجیے مضامین:

۱. حسرت موہانی، اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، جولائی ۱۹۰۲ء

۲. وجاہت علی صدیقی، مخزن، لاہور، مئی ۱۹۰۷ء

۳. سید محمد فاروق، العصر، لکھنؤ، جون ۱۹۱۳ء

۴. محمد یحییٰ تنہا، زمانہ، کانپور، ستمبر ۱۹۲۵ء

۵. ضیا جالندھری، عالمگیر، لاہور، اکتوبر ۱۹۲۷ء

۶. فرحت شاہجہاں پوری، صحیفہ، لاہور، اگست ۱۹۵۹ء

۷. فاضل زیدی، پگڈنڈی، امرتسر، مارچ ۱۹۶۰ء

فدائی ملتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس کی شوخیٔ تقریر و گرمیٔ تحریر کا شیدائی ہوتا تھا اور اُس کا سا بننا چاہتا تھا۔ اس کے بہت سے نامور شاگرد ایک ایک کر کے، اُس کے بعد ہی راہیٔ مُلکِ بقا ہو گئے۔ مگر اب بھی جتنے پُختہ کلام اصحاب ہندوستان میں غالب کے تلمذ پر فخر کرنے والے موجود ہیں، شاید اتنے نام لیوا، ہم عصرانِ غالب میں سے کسی کے نہیں۔

میر مہدی مرحوم، جن کے انتقال پُر ملال پر آج ہم اظہارِ رنج کر رہے ہیں، ان میں لائق ترین گنے جاتے تھے۔ میر صاحب کے دوست اور مدّاح مولانا حالی جو خود نہایت بلند اصحاب میں ہیں، ایک غزل میں ہم عصرانہ داد دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بُلبُل کا ترانہ ہرگز

افسوس! کہ اب دہلی کے چمنِ سخن کے پُرانے عندلیبوں میں صرف داغ ہی باقی رہ گئے[۲۴] اور مجروح سا قادر الکلام چل بسا۔

میر مہدی مرحوم اپنی سادگیٔ وضع، حُسنِ اخلاق اور عزلت پسندی میں گزشتہ زمانے کے بزرگوں کی ایک عمدہ نظیر تھے۔ آخری عمر میں دولتِ بینائی کھو بیٹھے تھے اور یہ درد اکثر مُضمحل رکھتا تھا، مگر باوجود ان تکالیف کے شوقِ شعر کی گدگدی سے طبیعت کبھی خالی نہ رہی اور اب بھی وہ وہ، اشعار نکالتے تھے کہ صاحبانِ ذوق سُن کر وجد کرتے تھے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ان کا دیوان شائع ہوا تھا[۲۵]، جسے عموماً پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے دیباچے میں میر صاحب مرحوم یوں اس مجبوری کا اظہار کرتے ہیں جس کے سبب وہ شاعری پر اس قدر توجّہ نہ کر سکے، جس قدر دل چاہتا تھا۔ غدر سے پہلے صُحبتِ شعرائے کامل میسر تھی اور دن رات اسی شوق میں بسر ہوتی تھی کہ:

---

[۲۴] افسوس کہ اس مضمون کی اشاعت کے قریب پونے دو سال بعد داغ بھی چل بسے۔ تاریخ وفات: ۱۴، فروری ۱۹۰۵ء، ۹، ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ [تلامذہ غالب، ص ۲۴۵]

[۲۵] مظہرِ معانی (دیوانِ مجروح)، طبع اوّل: سرفراز پریس، دہلی، جولائی ۱۸۹۹ء

"یکایک اس چرخِ کج رفتار و زمانۂ ناہنجار نے ایک ایسا فتنہ اُٹھایا کہ ہنگامۂ رستخیز کو بھی پرے بٹھایا اور تند بادِ حوادث نے اس گلدستۂ احباب کو برگِ ریزانِ خزاں کی طرح درہم برہم کر دیا۔ وہ غدر ۱۸۵۷ء کا تھا کہ جس نے مردوں سے خاک کا پیٹ بھر دیا اور دہلی کو آدمیوں سے خالی کر دیا۔ بہت سے سربر دار اور اکثر گرفتار اور باقی فرار ہو کر اطرافِ جہاں میں منتشر ہوئے۔ پھر تو کبھی تلاشِ معاش، کبھی یادِ وطن جاں خراش، کبھی مرگِ احبار دل شکن، کبھی زمانے کے رنج و محن، اس میں کیسی فکرِ شعر و سخن [۴۶]"

اس کے بعد اُن اسباب کا بیان کرتے ہیں جن کے سبب اس مختصر سے دیوان کا بھی جمع ہو جانا ممکن ہوا :

"برسوں تک یہی حال رہا۔ آخر جب کچھ اسبابِ دل جمعی فراہم ہوئے اور بچے کھچے احباب یک جا ہوئے تو پھر وہی شوقِ پیشینہ کی چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ کوئی غزل کی فرمائش کرتا ہے کوئی تاریخ کہنے کی خواہش کرتا ہے۔ ہر چند کہا وہ دفتر گاؤ خورد ہُوا، گھر لُٹ گیا، وطن چھُٹ گیا، تصنیف کا ذخیرہ خوانِ یغما ہو گیا۔ اب افسردہ دل، حواس مختل پراگندہ خاطر، ذہن قاصر، ایسی کاہش میں یہ خواہش نئی بات ہے۔ بُلبُلِ شوریدہ مغز سے ترانا سرائی کی اُمید غضب ہے اور پژمردہ دل سے گُل ہائے تازہ مضامین کی طلب عجب ہے۔ مگر کون سُنتا تھا۔ وہی اصرار برقرار رہا ناچار..... کوئی فرمائش کرتا اُس کو بجا لانا پڑتا، وہ بھی اس بے دلی سے کہ مسودہ تک بھی پاس نہ رکھا جاتا تھا ــــ بعد، ایک عرصے کے یاروں نے کہا کہ دیوان چھپواؤ۔ مَیں حیران ہُوا کہ دیوان تو ہے نہیں، چھپواؤں کسے، بقول شاعر :

---

[۴۶] دیباچہ (سببِ تالیف)، مظہرِ معانی، ص ۷

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے!

مگر میرے دوست دلی، مشفقی میر افضل علی عرف میرن صاحب نے کمرِ ہمت باندھی اور وہ پرچے جو میرے حواس کی طرح منتشر اور میرے حال کی طرح پریشان پڑے ہوئے تھے، اُن کو جمع کر کے محنتِ شبانہ روز سے چند ماہ میں ہیولا دیوان کا دُرست کیا[۲۷]....."

بس یہی دیوان مرحوم کی بہترین یادگار ہے اور اہلِ شوق کو اس میں ایسا پاکیزہ کلام مل سکتا ہے جس کی اس زمانے میں نظیر کمیاب ہے۔ نمونے کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں[۲۸]:

کچھ اَن بَن ہو چلی ہے باغباں سے
بس اب نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

نہ ہونے سے ترے، سب کام بگڑے
تجھے اے صبر میں لاؤں کہاں سے

گرفتاری کے دن آئے ہیں شائد
کچھ اُلفت بڑھ چلی ہے آشیاں سے

کیا ہے شوقِ منزل نے یہ بے تاب
بڑھا جاتا ہوں کوسوں کارواں سے

ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے اس کا سننا
جگر پھٹتا ہے میری داستاں سے

میں اس بے مائگی سے خوش ہوں مجروح
کہ فارغ ہو گیا ہوں سود و زیاں سے"

[مخزن، لاہور، جلد ۵، نمبر ۲، مئی ۱۹۰۳ء، ص ۵۵-۵۶]

---

۲۷ دیوانِ مجروح (مظہرِ معانی)، ص ۷، و ما بعد

۲۸ دیوانِ مجروح (مظہرِ معانی) میں یہ غزل سترہ اشعار پر مشتمل ہے۔

[۴]

اور اب ___ میر مہدی مجروح کا وہ اَدب پارہ جو، ایک سو گیارہ[111] برس سے بھی پہلے ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کو "اکمل الاخبار" دہلی میں شائع ہُوا اور جو غالب کے بعد اُن پر پہلے تعزیتی مضمون کا امتیازِ خاص رکھتا ہے[۲۹]، غالب دوستوں کی نذر کرتا ہوں :

"فخرِ عرفی و رشکِ طالب مُرد

اسد اللہ خاں غالب مُرد"

"فغاں اس زمانۂ غدار سے، آہ روزگارِ ناہنجار سے، ہر روز نیا نیرنگ دکھاتا ہے۔ ہر دم دامِ غم واَلم میں پھنساتا ہے۔ اس محیطِ آفت کی موج بلا خیز ہے۔ اس وادیٔ ہولناک کی ہَوا فتنہ انگیز ہے۔ اس کا آب سراب، اس کی بُنیاد خراب، اس کی راحت جزوِ جراحت، اس کی رافت سرمایۂ دو صد آفت، اس کی شکر زہر آلُود، اس کی اُمیدِ آرزو فرسود ___ ہر روز نخلِ حیات کو صرصرِ ممات سے گراتا ہے۔ ہر دم محفلِ سرور سے صدائے ماتم اُٹھاتا ہے۔ کبھی پدر کو فراقِ پسر سے خُون رُلاتا ہے، کبھی بھائی سے بھائی کو چُھڑاتا ہے۔

ہر گلِ زمین میں دامِ فریب نہاں ہے۔ ہر نوش لذّت میں نیشِ محنت پنہاں۔ خزاں سے توام فصلِ بہار ہے۔ روزِ روشن کے ساتھ ہی شبِ تار ہے۔ مآلِ خندہ شادی گریۂ غم ہے اور نتیجۂ عیش، صد گونہ اَلم ___ حباب ابھی نمودار ہوا، ابھی کچھ نہ تھا۔ پھول اِدھر کھلا، اُدھر گر پڑا۔ لالہ لباسِ رنگیں میں بھی داغ دل پر رکھتا ہے۔ غنچہ خونِ جگر سے پرورش ہوتا ہے۔ بُلبُل نوحہ گرِ چمن ہے اور مُرغِ سحر خوانِ اسیرِ محن :

---

[۲۹] اکمل الاخبار، دہلی کا یہ شمارہ ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء کے بعض مُتفرق پرچوں کے بشمول، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں محفوظ ہے۔

دریں زمانہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

وائے ہم گران خوابانِ غفلت پر کہ اس رشتۂ عمر پر جو تارِ عنکبوت سے زود گسل ہے، اس کے بھروسے پر کیا کیا طولِ اَمل ہے:

اذاں سرو آمد ایں کاخِ دلآویز
کہ جا ناگرم کردہ گویدت خیز

اس نابود کو بود، جحیم کو نعیم، دمن کو چمن، گلخن کو گلشن، خواب کو بیداری، غفلت کو ہوشیاری جانتے ہیں اور اس قدر بادۂ غفلت سے مست ولایعقل ہیں کہ حق کو باطل سے نہیں پہچانتے۔ کیا عجب اگر آسمان درپئے آزار ہے۔ بھلا اس سے کیا توقعِ آسودگی جس کو خود گردش پر مدار ہے ــــــ

دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اُٹھائی ہے، کس منتخب روزگار کی جُدائی دکھائی ہے۔ نخلِ برومند معانی کو بادِ خزانی سے گرایا، مہرِ سپہرِ سخندانی کو خاک میں ملایا ــــ جو خسرو کے بعد ملکِ سخن کا خسرو مالک رقاب تھا، اس کا نامۂ عمر طے ہُوا، جو میدانِ سخنوری کا شہسوار ہلال رکاب تھا اس کا رخشِ زندگی پَے ہُوا۔

ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا بیان کیا جائے، دریا کوزے میں کیوں کر سمائے۔ حُسن خلق میں اخلاق کی کتاب، عمیم الاشفاق میں لاجواب، خوبیٔ تحریر میں بے نظیر، صافی ضمیر، جادو تقریر، فارسی زبان میں لاثانی، اُردوئے مُعلیٰ کے بانی۔ افسوس جس کا شہبازِ خیال طائرِ صد رہ شکار ہو، وہ پنجۂ گرگِ اجل میں گرفتار ہو ــــ صد حیف اُس (د) سادہ آرائے سخن دری کو تختہ پر لٹائیں۔ ہائے اس رنگین سخن کو سفید کفن پہنائیں جو ایک دم، فراقِ احبار کی تاب نہ لائے، اُس کو یوں تنہا قبر میں چھوڑ آئے ــــ

اس غم سے سب کی حالت تباہ ہے، روز بھی اسی مُصیبت میں سیاہ ہے۔ اس

روز کو روزِ محشر کہوں ۔ مگر کیا کہوں سُنتے ہیں کہ قیامت میں بچھڑے ہوئے ملیں گے، ملاقاتیں کریں گے۔ یہ کیسی قیامت آئی ہے، جس میں ایسے شفیق سے جُدائی ہے۔ دل ہے پتھر نہیں ۔ اس صدمۂ جانکاہ سے کیوں کر نہ گھبرائے۔ چشم ہے فولاد نہیں، کیوں کر نہ اشک بہائے ـــــ جس کا سینہ نشترزار ہو، اُس کے لب پر کیوں کر نہ آہِ شرربار ہو ـــــ جس کا جگر خنجرِ غم سے فگار ہو، وہ کیوں کر نہ بے قرار ہو ـــــ جس کی جان میں کاوشِ پنہاں ہو، وہ کیوں کر نہ نالاں ہو ـــــ جس کے دل میں غمِ جاں گسل دشمن شکن ہو، اُس کا کیوں کر نہ خونچکاں سُخن ہو۔ قلم بھی میری طرح سینہ چاک ہے اور دیدۂ دوات گریہ ناک۔ اب توضیح اجمال و تفصیل مقال ہے۔

واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے صاحبِ فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سہے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا، اس دُنیائے فانی سے بالکل دل اُٹھایا تا آنکہ ۱۵ ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روز دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے مہرِ فلک کے ساتھ ہی اُس خورشید اوجِ فضل و کمال کو زوال ہوا۔ یعنی اس سپنجی سرائے بے بُنیاد سے عدم آباد کی طرف کوچ کیا۔ نہ غرغرہ نزع کی تکلیف پائی، نہ کشاکشِ جاں کنی کی مصیبت اُٹھائی۔

سب عمایدِ شہر بیرونِ دہلی دروازہ نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ بعد نماز کے حضرت سُلطان نظام الدین قدس اللہ سرہٗ کی درگاہ میں پہنچایا اور اس گنجِ معانی کو تہِ خاک چھپایا۔ اس مجروح دل افگار نے یہ حال سراپا ملال اس لیے درجِ اخبار کیا تا اس قدوہ شعر کے محبّانِ باصفا حضرت مغفور کے مُستغرقِ رحمت ہونے کی خبر پائیں اور چشمِ پُرنم سے اشکِ حسرت بہائیں؛

قطعۂ تاریخ

کل مرقدِ اُستاد پہ افراطِ اَلم میں
ہاتف نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غمناک
بولا ہے اگر فکر میں تاریخ کی، مجروح!
کہہ دے نہ یہی "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"[1]

۸۵ ۱۲ھ

ماخوذ از: اکمل الاخبار، دہلی، جلد ۴، نمبر ۷، صفحہ ۵۵

مطبوعہ: ۱۷؍فروری ۱۸۶۹ء روزِ چہار شنبہ، مطابق ۴؍ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری بشہر دہلی، محلہ بلیماراں در دیوان خانہ حکیم محمود خاں صاحب مدظلہم العالی، باہتمام سیّد فخرالدین منطبع گردید۔

○

---

[1] میر مہدی مجروح کے دیوان "مظہرِ معانی" طبع اوّل ۱۸۹۹ء میں یہ قطعہ بہ ترمیم ذیل درج ہے (صفحہ ۲۳۹):

کل حسرت و افسوس میں مَیں بادلِ محزوں
تھا تربتِ اوستاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

۸۵ ۱۲ھ

غالب کے لوحِ مزار پر بھی مجروح کا یہ قطعہ کندہ ہے، لیکن پہلے مصرع کی صورت یہ ہے:
"کل مَیں غم و اندوہ میں باخاطرِ محزوں"

غالب اور مجروح کی مراسلت

[۱]

میر مہدی حسین مجروح دہلوی (۱۸۳۳ - ۱۹۰۳ء) غالب کے عزیز شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ۱۸۹۹ء میں ان کا دیوان "مظہر معانی" کے تاریخی نام سے شائع ہوا۔ میر مہدی مجروح "غالب کے تلمذ پر فخر کرنے والوں میں لائق ترین گنے جاتے تھے"۔[۱]

۱۸۸۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کے انتقال پر دلی میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا۔ اس میں حالی، داغ، مجروح اور دوسرے بہت سے اکابر شعرا نے شرکت کی۔ حالی نے اس مشاعرے میں مجروح کو داد دیتے ہوئے سامعین سے یوں خطاب فرمایا تھا:

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

مجروح محض قادر الکلام شاعر ہی نہ تھے، نثر میں بھی استادانہ قدرت رکھتے تھے۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ مجروح نے:

"دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرت رسول کریمؐ کے معجزات کے بیان میں

۱۔ سر شیخ عبدالقادر، مخزن، لاہور، مئی ۱۹۰۳ء ص ۵۵

"انوار الاعجاز" اور دوسرا ائمہ کے بیان میں 'ہدیۃ الائمہ'۔ دونوں اب کمیاب ہیں۔ ایک تذکرہ بھی 'طلسمِ راز' لکھا تھا، یہ بھی اب نایاب ہے۔ اس پر غالب نے جو تقریظ فارسی میں لکھی تھی، وہ ان کی کلیاتِ نثر میں موجود ہے۔" (تلامذۂ غالب' طبع اول' ص۲۰۵)

اِن نثری یادگاروں کے علاوہ 'تاریخ گنجِ غرائب' (۱۲۸۶ھ/۷۰-۱۸۶۹ء) بھی مجروح سے منسوب ہے۔ 'اُردوئے معلّٰی' کا دیباچہ بھی مجروح کا لکھا ہوا ہے۔ غالب نے اپنے ایک سے زیادہ خطوں میں مجروح کے اُردو عبارت لکھنے کے ڈھنگ کی داد دی ہے

اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی میں مجروح کے نام غالب کے پچاس کے لگ بھگ خط شامل ہیں اور ابھی بہت سے خط ایسے ہوں گے جو سامنے نہیں آئے۔ خود غالب کے نام[۲] مجروح کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ خوبیِ قسمت سے محفوظ لیکن اشاعت کا منتظر ہے۔ چودہ برس ہوئے آفاق حسین آفاق دہلوی نے اپنے ایک مضمون میں 'مکتوباتِ غالب و مجروح' کے اس ذخیرے کی نشان دہی کی تھی۔[۳] مولوی مہیش پرشاد[۴] اور فاضل زیدی بھی[۵]

---

[۲] غالب کے نام خطوں کی تلاش ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اسی طرح کا ایک مجموعہ 'بنام غالب' اکبر علی خاں عرشی زادہ نے کئی برس کی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ غالب کے مکتوب الیہم کے کئی سو خطوط جو غالب کے نام لکھے گئے، اس مجموعے میں شریک کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے خط عرشی زادہ کے بقول ایسے ہیں جن کا علم غالب دوستوں کو نہیں اور جن سے خود غالب کے خطوط کے مفاہیم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جن لوگوں کے خطوط اس میں شامل ہیں ان میں مجروح، بے خبر، شیفتہ، تفتہ، بے صبر، ناطق گرانی، ذکا حیدرآبادی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ یہ مجموعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اشاعتی پروگرام میں شامل رہا ہے۔ تاحال چھپا نہیں ہے۔

[۳] ماہِ نو کراچی، فروری ۱۹۵۵ء

[۴] اُردو ادب علی گڑھ، جنوری، اپریل ۱۹۵۱ء

[۵] طوفان، نواب شاہ، فروری ۱۹۵۲ء

مختلف مواقع پر مجروح کے متفرق مکاتیب شائع کر چکے ہیں۔

[۲]

اس موقع پر اسی سلسلے کی ایک نادر کڑی کے طور پر "غالب و مجروح کی مکاتبت" پیش کی جاتی ہے۔ اس عنوان سے یہ مکاتیب نصف صدی سے بھی پہلے مولوی عبدالحق مرحوم کی مختصر تمہید کے ساتھ رسالہ 'الناظر' لکھنؤ میں[1] شائع ہوئے تھے اور اب بالعموم نظر سے اوجھل تھے۔ ان خطوں کی تفصیل یہ ہے:

١۔ نامۂ غالب : ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء
جوابِ مجروح : مارچ ۱۸۵۹ء

۲۔ نامۂ غالب : ۲۷۔ مارچ ۱۸۵۹ء
جوابِ مجروح : اپریل ۱۸۵۹ء

۳۔ نامۂ مجروح : جون، جولائی ۱۸۵۹ء
جوابِ غالب : ۶۔ جولائی ۱۸۵۹ء

۴۔ نامۂ غالب : ۲۔ دسمبر ۱۸۵۹ء
جوابِ مجروح : دسمبر ۱۸۵۹ء
جواب الجواب از غالب : ۱۳۔ دسمبر ۱۸۵۹ء

۵۔ نامۂ غالب : ۱۸۶۱ء
جوابِ مجروح : مئی ۱۸۶۱ء
جواب الجواب از غالب : ۲۳۔ مئی ۱۸۶۱ء

میں نے غالب کے ان خطوں کا 'خطوطِ غالب' مرتبہ مالک رام (مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۲-۶۳ء)

---

[1] الناظر لکھنؤ، جلد ۱۰، نمبر ۵۹، یکم مئی ۱۹۱۴ء، ص ۱-۱۰

سے مقابلہ کیا تو کہیں کہیں متن میں فرق پایا۔ بعض صورتوں میں ان خطوں میں فقرے کے فقرے زیادہ ہیں ۔ ایک آدھ موقع پر یہاں غالب کے خط پر تاریخ و سنہ درج ہے لیکن "خطوطِ غالب" میں موجود نہیں اور یہ ان خطوں کی بڑی وجہ اہمیت ہے۔ اس طرح کے سارے قابلِ ذکر اختلافات حواشی میں ظاہر کر دیے گئے ہیں۔ 'الناظر' میں یہ خط بغیر کسی ترتیب کے درج تھے ۔ میں نے اس ترتیب کو بجنسہٖ قائم نہیں رکھا۔ اب یہ خط سلسلہ وار مع جوابات درج کیے گئے ہیں ۔

ابتداءً مولوی عبدالحق کی "تمہیدی عبارت" بھی ضروری حواشی کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے :

(۳)

مولوی عبدالحق کی تمہیدی عبارت :

" میرن صاحب[1] مرحوم نے جنھوں نے مرزا غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں اور مرزا غالب بھی اُن سے بہت محبت کرتے تھے جیسا کہ اُن کے واقعات [رقعات ؟] سے ظاہر ہے ، میرے لیے چند رقعے جناب مرزا صاحب کے مع میر مہدی مجروح مرحوم کے جوابات کے نقل کر کے بھیجے تھے ۔ بیچارے میرن صاحب تو اپنے گھر سدھارے مگر ان کی یہ یادگار میرے پاس رہ گئی اگرچہ ان میں سے بعض رقعے چھپ چکے ہیں مگر میر مہدی مجروح کے رقعات

---

[1] میرن صاحب کے تعارف میں رجوع کیجیے مضمون مولوی عبدالحق مشمولہ :

(i) سہ ماہی اُردو ، اورنگ آباد ، جولائی ۱۹۳۶ء ، ص ۳۸۰ - ۳۸۴

(ii) چند ہم عصر ، کراچی ۱۹۵۹ء ، ص ۲۰۰ - ۲۲۴

کے ساتھ ان کا لطف دوبالا معلوم ہو گا۔ نیز اس زمانے کی حالت، باہمی تعلقات و محبت اور اُن کے خیالات کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ محبت و اخلاص، البتہ اُن کی باتیں یاد رہ گئیں۔ شاید آپ کے ناظرین انھیں پڑھ کر مزا لیں اور دیکھیں کہ جس کے زورِ قلم اور قوتِ تخیل سے نہ صرف اُردو کو بلکہ خود صنفِ شعر کو ناز ہے، معمولی سے معمولی باتوں میں بھی ایک بات پیدا کرتا ہے اور اپنے ملنے والوں سے کس محبت اور پیار سے پیش آتا ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی معمولی چیزیں ہیں جن سے انسان کے اصل کیریکٹر کا پتہ لگتا ہے۔" [عبدالحق]

یہاں غالب، تصانیف و نگارشاتِ غالب یا تصانیف متعلق بہ غالب کے بارے میں مولوی عبدالحق کے بعض بیانات کے حوالے بے محل نہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں دیکھیے:

۱۔ رپورٹ انجمن ترقی اُردو، بابت جنوری مارچ ۱۹۱۴ء درضمیمہ: الناظر، لکھنو، مئی ۱۹۱۴ء

۲۔ ایضاً، بابت اپریل ۱۹۱۴ء، درضمیمہ: الناظر، لکھنؤ، جون ۱۹۱۴ء

۳۔ سہ ماہی اُردو، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۱ء، ص ۹

۴۔ سہ ماہی اُردو، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ص ۶۳۹

۵۔ اُردو، جنوری ۱۹۲۳ء، ص ۱۳۸ - ۱۳۹

۶۔ اُردو، اپریل ۱۹۲۴ء، ص ۳۵۹ - ۳۶۳

۷۔ اُردو، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۵۰۱ - ۵۰۴

۸۔ اُردو، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۳۶۹

۹۔ اُردو، جولائی ۱۹۲۸ء، ص ۳۲۷ - ۳۲۹

۱۰- اُردو، جنوری ۱۹۲۹ء، ص ۱۶۳ - ۱۶۷
۱۱- اردو، اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۱۶۷ - ۱۶۹
۱۲- اُردو، جولائی ۱۹۲۹ء، ص ۵۸۱ - ۵۸۲
۱۳- اُردو، اکتوبر ۱۹۲۹ء، ص ۷۹۲ - ۷۹۳
۱۴- اُردو، جنوری ۱۹۳۲ء، ص ۷۱
۱۵- اُردو، جنوری ۱۹۳۳ء، ص ۲۲۸ - ۲۳۰
۱۶- اُردو، جنوری ۱۹۳۴ء، ص ۱۹۴ - ۱۹۵
۱۷- اُردو، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۳۱۴
۱۸- اُردو، اکتوبر ۱۹۳۹ء، ص ۷۰۱ - ۷۰۵
۱۹- اُردو، دہلی، جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۱۵۸ - ۱۶۰
۲۰- اُردو، اپریل ۱۹۴۲ء، ص ۱۵۱ - ۱۵۲
۲۱- اُردو، اپریل ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۲ - ۱۷۰
۲۲- اُردو، اکتوبر ۱۹۴۴ء، ص ۵۵۸ - ۵۵۹
۲۳- سرنامہ، نادرات غالب (آفاق دہلوی) طبع اوّل، کراچی ۱۹۴۹ء، ص ۳ - ۴
۲۴- اُردو، کراچی، اپریل ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۸ - ۱۶۰
۲۵- اُردو، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۷ - ۴
۲۶- اُردو، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۴۱۴ - ۴۱۵
۲۷- اردو، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۲۲۵ - ۲۲۶
۲۸- مقدّماتِ عبدالحق (عبادت بریلوی)، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۴۵۲ - ۴۵۳
۲۹- قومی زبان، کراچی، فروری ۱۹۶۷ء، ص ۷ - ۹
۳۰- تنقیداتِ عبدالحق، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۹۷
۳۱- تذکرہ مخزنِ شعرا، (فائق) مطبوعہ ۱۹۳۳ء

اور اب توضیحی حواشی کے ساتھ سلسلہ وار ملاحظہ فرمائیے غالب و مجروح کے مکاتیب :

[۴]

نامۂ غالب[۸]

میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں، صد آفریں۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا[۹] اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا[۱۰]۔ سنو، دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم، پانی پت انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا[۱۱]۔ میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔ میری[۱۲] پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہ سمجھ لو۔ وللرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک طرزِ خاص پر تحریک ہوئی۔ سررشتہ کی پابندی ضرور ہے[۱۳]۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے

---

۸ رسالہ الناظر لکھنؤ، جلد ۱۰، نمبر ۵۹، یکم مئی ۱۹۱۴ء (= الناظر) میں غالب و مجروح کے خطوں پر نمبر شمار، مسلسل درج ہے۔ الناظر میں باعتبارِ ترتیب یہ میرا خط ہے۔

۹ خطوطِ غالب، مالک رام، علی گڑھ ۱۹۶۲ء (= خم) میں 'کیا' ندارد

۱۰ مجروح کے جس خط کی داد دی گئی ہے اور جس کے طرزِ تحریر پر غالب نے رشک کیا ہے، افسوس کہ وہ ادب پارہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

۱۱ غالب کے اس جملہ خط کے بارے میں حالی نے لکھا ہے:

"اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں، کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے، مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلّے کا رہنے والا ہے، ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے، اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا، اسی قدر ان کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہِ کسرِ نفسی کے لکھتا ہوں۔" (یادگارِ غالب، صفحہ ۱۰۷، طبع کانپور، ۱۸۹۷ء)

۱۲ خم: میرے۔ ۱۳ خم: "سررشتہ کی پابندی ضرور ہے" ندارد

حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کی پنشن[۱۲] کے کل چڑھے ہوئے روپے[۱۳] یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر، ہمارے پاس بھیج دو، تاکہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ یہاں[۱۴] اس کی تعمیل فوراً[۱۵] بطرز مناسب ہو گئی کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا۔

اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوالو۔ میں نے کہا: "صاحب، یہ کیسی بات کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو۔" فرمایا کہ "تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجراء کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات شاید[۱۶] برسوں میں میسر آئے گی۔" میں چپ ہو رہا۔

آج دو شنبہ، یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیہ منگالوں۔ پر یار، ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اُس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم، یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔

حاکم پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ بھی حکم[۱۷] ہے کہ 'دستنبو' منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اُس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب[۱۸] مجھ سے بھی کہہ کر مانگی اور میں نے دے[۱۹] دی۔ اب دیکھوں، حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔

اس وقت تمہارا ایک خط، اور یوسف میرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میرن صاحب

---

۱۳ خم : روپے کے۔ ۱۴ خم : سو یہاں
۱۵ خم : 'فوراً' ندارد [حاشیہ ع = تعمیل فوراً]
۱۶ خم : 'شاید' ندارد
۱۷ خم : پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے۔۔۔۔
۱۸ خم : کتاب یہی کہہ کر ۱۹ خم : 'دے' ندارد

میر سرفراز حسین[۲۱]، میر نصیر الدین کو دعا۔ ۱۲۔ غالب۔

[دوشنبہ، یکم شعبان (۱۲۷۵ھ)، ہفتم مارچ (۱۸۵۹ء)][۲۲]

جوابِ مجروح[۲۳]:

قبلہ وکعبہ آداب بجالاتا ہوں۔ بھلا حضرت یہ آپ کیا فرماتے ہیں، آپ کے طرز پر لکھ سکوں۔ توبہ استغفراللہ۔ چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک۔ مہرِ عالم افروز کے سامنے ذرّۂ ناچیز کی کیا نمود اور بحرِ بیکراں کے رُوبرُو قطرۂ تنک ظرف کا کیا وجود۔ یہ دعویٰ میاں ظہوری کریں۔ یہ اندیشہ نظیری کو آوے۔ میں بیچارہ کس حساب میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات جمیع کمالات کو اس فن میں یکتا پیدا کیا ہے، ہاں اگر دو چار برس قدموں میں پڑا رہوں اور فضل و کمال کی طرح دروازے پر حاضر رہوں تو البتہ کچھ راہ پر آجاؤں۔ سو یہ چرخِ تفرقہ پرداز کب کسی کو اپنی مراد پر پہنچاتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ دو آدمی حسبِ دلخواہ ایک جگہ مل بیٹھیں۔

کچھ ان دنوں میں آپ ہی آپ جی گھبراتا ہے اور شوقِ قدم بوسی یہ ولولہ افگن ہے کہ چل اور خاکِ قدم کو صندلِ پیشانی کر۔ اگر حضرت، یہی صورت ہے تو دو چار دن میں حاضر ہوتا ہوں اور اختصاصِ قدم بوسی پاتا ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔ میر مہدی[۲۴]

---

۲۱ نم: میر سرفراز حسین مقدم، میرن صاحب مؤخر۔

۲۲ خط پر تاریخ سنہ وغیرہ درج نہیں، لیکن خط میں کتاب 'دستنبو' کا ذکر آیا ہے جو پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپی۔ دن، ماہ و تاریخ کا تذکرہ خط کے متن میں آگیا ہے۔

۲۳ 'الناظر' میں باعتبارِ ترتیب چوتھا خط۔

۲۴ میر مہدی مجروح کے اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں۔ غالب نے پچھلے خط [ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء] میں مجروح کی انشا پردازی کی داد دیتے ہوئے اسے اپنا خاص طرز بتایا تھا۔ مجروح نے اس کے حوالے سے جواباً انکسار کا اظہار کیا ہے، گویا مجروح کا یہ خط، نامۂ غالب مورخہ ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء ہی کے جواب میں ہے۔ اسی سے اس کا زمانۂ تحریر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

نامۂ غالب[25]

سید۔ خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے[26] کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اُٹھایا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے۔ تم کو سرمایۂ آرائش گفتار پہنچا ہے[27]۔ میری اُن کو دعا پہنچاؤ اور اُن کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہِ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے، پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی، اور کیسی بڑی خوشی دی ہے! تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر اور دوسری گورنر جنرل بہادر کلکتہ[28] کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا۔ وہ کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔

پنشن ملنے کا بھی حکم آجکل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل (کذا) بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میران صاحب

۲۵؎ 'ادنا ظر' میں باعتبار ترتیب آٹھواں خط ہے۔

۲۶؎ مجروح کا وہ خط، یعنی جس کے جواب میں غالب انھیں یہ خط لکھ رہے ہیں کہ "سید، خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا....." دیدنی ہوگا۔ افسوس کہ منظر عام پر نہیں آیا۔

۲۷؎ خم: "بہم پہنچا"۔

۲۸؎ خم: "..... اور دوسری گورنر جنرل بہادر کلکتہ کی نذر بھیجی تھیں" ندارد۔

کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین[۲۹] کو دعا کہہ دینا[۳۰] ۔ غالب

[۲۷- مارچ ۱۸۵۹ء][۳۱]

جواب مجروح[۳۲]

قبلہ و کعبہ - کیا آپ نے میرن صاحب کو سچا بنایا ہے کہ مہاسا نکلے گا۔ بوڑھے منہ مہاسے، لوگ آئے تماشے۔ وہ فاسد مادہ تھا کہ اُن کے چہرے پر آگیا تھا۔ یہاں کے حکیموں نے تو جواب ہی دے دیا تھا کہ یہ دو چار دن کے مہمان ہیں۔ مگر اللہ نے اچھا کیا کہ حکیم میر اشرف علی آئے ہوئے تھے، انھوں نے دو فصدیں کھلوائیں۔ ضمادات رادع کا استعمال کیا، جب کچھ آدمیوں کی صورت میں آئے ہیں۔ آپ نے یہ ہنسی کبھی ہوگی جو فرماتے ہیں کہ تم کو سرمایۂ آرائش گفتار بہم پہنچا۔ لیجیے حضرت، اب تو وہ اچھے ہوگئے، چلتے پھرتے ہیں۔ اور حضرت گورنر جنرل بہادر کی سلسلہ جنبانی کا حال جو تحریر فرمایا ہے اس سے دل کو مسرت و فرحت بے اندازہ حاصل ہوئی۔

اب اللہ یہ اُمید بر لائے کہ اب کے خط میں یہ خبر آپ تحریر فرمائیں کہ روپیہ پنشن کا تو آکر خرچ برچ میں آگیا اور عطیۂ ملکۂ معظمہ بھی صبح و شام آنے والا ہے۔ زیادہ حد ادب۔

میرن صاحب و میر نصیر الدین آداب عرض کرتے ہیں۔ میر مہدی[۳۳]

---

[۲۹] خم : میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین ۔

[۳۰] اضافہ در خم : اور یہ خط دکھا دینا ۔

[۳۱] تاریخ ۲۷۔ مارچ کا ذکر متن میں آگیا ہے، سال : ۱۸۵۹ء

[۳۲] 'انا ظر' میں باعتبار ترتیب نواں خط

[۳۳] مہدی مجروح خط پر تاریخ درج کرنے کے عادی ہی نہیں معلوم ہوتے ۔ ان کے خطوں کی تاریخوں کا تعین غالب کے خطوں کی روشنی ہی میں ہو پاتا ہے ۔ یہ خط غالب کے خط مورخہ ۲۷۔ مارچ کے جواب میں ہے، اس لیے ظاہر ہے اس تاریخ کے بعد کی کسی قریبی تاریخ کا ہوگا ۔

نامۂ مجروح[۳۴]

قبلہ و کعبہ سلامت۔ بعد گذارشِ آداب، عرض رسا ہوں۔ حضرت، نیامِ بے شمشیر، کمانِ بے تیر، چشمِ بے تنویر، نغمۂ بے تحریر، قالبِ بے جان، یعنی آپ کا بے خط کا عنوان پہنچا۔ جس قدر لفافہ سربستہ دیکھ کر دل کھلا تھا اتنا ہی کھول کر دل بند ہوا۔ اِدھر ٹٹولا، اُدھر ٹٹولا، کچھ نہیں۔ خطِ اصلاحی کو اُلٹا پلٹا، شاید کہیں ایک دو سطریں لکھیں (کذا) ہوں، وہ بھی ندارد۔ یا اللہ یہ کیسا خط ہے، کہ خط ہے اور خط نہیں۔ معلوم ہوا کہ بظاہر کا لفافہ ہے اندر کچھ نہیں اور یہ صورت حایل معنی نہیں۔

میرن صاحب کہتے ہیں جناب میرزا صاحب کا خط دکھاؤ۔ میر اشرف علی کہتے ہیں مطلب سناؤ۔ جن کو اردو کا شوق ہے، ان سے کہتا ہوں، فارسی خط ہے کیا مزا اٹھاؤ گے جو فارسی کے خواہاں ہیں اُن سے کہتا ہوں اردو ہے، دیکھ کے کیا نفع پاؤ گے۔ واہ واہ حضرت، خوب ہنسی کی۔

اب یہ فرمائیے کہ آپ نے واقعی میں خط نہیں لکھا یا لفافے میں رکھنا فراموش کیا۔ شق اول آپ کے الطافِ بزرگانہ سے بعید ہے کہ اتنی مدت کے بعد میرا عریضہ جائے اور آپ سا شخص، اُس کے جواب میں دریغ فرمائے اور شقِ ثانی میں اُمیدوار و منتظرِ ورودِ نوازش نامہ سمجھیے اور جلد ارسال کیجیے۔ زیادہ اور کیا سمع خراشی کروں۔ فدوی میر مہدی مجروح[۳۵]

---

[۳۴] ’اناظر‘ میں باعتبارِ ترتیب یہ دسواں خط ہے۔ ماہِ نو، کراچی، شمارہ فروری ۱۹۵۵ء میں سید آفاق حسین دہلوی نے مجروح کے اس خط کا قلمی عکس شائع کرایا ہے۔ یہ متن قلمی عکس کے مطابق پیش کیا جارہا ہے۔

[۳۵] مجروح کے اس خط کے جواب میں غالب نے چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء کو خط لکھا (یہ آگے آتا ہے)۔ مجروح کا یہ خط گویا اواخر جون یا اوائل جولائی ۱۸۵۹ء کا مکتوب ہے۔

جوابِ غالب[۳۶]

برخوردار کامگار میر مہدی ۔ قطعہ تم نے دیکھا ؟ سچ مچ میرا حلیہ ہے۔ واہ، اب کیا شاعری رہ گئی ہے! جس وقت وہاں[۳۷] بھیجنے کے واسطے لکھا، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان، چلو کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا، اب خط[۳۸] کیوں لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا، سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، گھر میں چلا گیا۔ اور ہاں، ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو، وہی ہوا تم نے جلے[۳۹] پھپھولے پھوڑے۔ لو اب بتاؤ، خط لکھنے بیٹھا ہوں، کیا لکھوں۔ یہاں کا حال، زبانی میرن صاحب کی[۴۰] سن لیا ہوگا۔ بے اصل[۴۱] باتیں ہیں۔ پنشن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر، یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اس میں کیا ضرر۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا۔ باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی، چراغ روشن ہوا۔ منشی میر[۴۲] احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ۔ اس کے سر پر ٹوکرا۔ اس پر گھانس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا۔ اہا ہا سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین دہلوی نے

---

[۳۶] الناظر میں باعتبار ترتیب گیارھواں خط

[۳۷] خم : جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں . . . [۳۸] خم : کہ اب، کیوں . . . .

[۳۹] خم : 'جلے' ندارد [۴۰] خم : کے

[۴۱] خم : مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا بے اصل . . . . .

[۴۲] خم : 'سید' بجائے 'میر'

دوبارہ رسد[۴۳] بھیجی ہے۔ بارے، معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں[۴۴] لطفِ عام ہے یعنی[۴۵] شراب نہیں، آم ہے، خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے، بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو، ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا، لکور[۴۶] سے بھرا ہوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ بے شیشہ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے! میاں کہتا تھا کہ یہ اسی تھے، پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے تا اُن کی برائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہیں؟ مگر میں تمہاری تکلیف و تکلف سے خوش نہیں ہوا، تمہارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے۔ خانہ آباد دولت زیادہ۔

لکور کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے[۴۷] ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے۔ ہاں فرہنگِ سروری میں ہوں تو ہوں۔ مجتہد العصر کو[۴۸] اور حکیم میر اشرف علی کو دعا کہہ دینا[۴۹] میرن صاحب پوچھیں تو کہنا تمہیں کچھ نہیں لکھا۔

مرقومۂ چہار شنبہ، ششم جولائی ۱۸۵۹ء[۵۰] غالب۔

---

۴۳ خم: 'رسید' بجائے 'رسد' ۴۴-۴۵ خم: 'نہیں' اور 'یعنی' ندارد

۴۶ یعنی LIQUOR ۴۷ خم: "... کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے" ندارد

۴۸ خم: 'کو' ندارد۔

۴۹ خم: "...... میر اشرف علی کو کہ وہ اُن کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں، میری دعا کہہ دینا۔" میرن صاحب کا ذکر ندارد۔

۵۰ خم: تاریخ ندارد۔ اس طرح ناظر کے اس خط کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے کہ اس کی مدد سے غالب کے ایک خط کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

نامۂ غالب[۵۱]

بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے[۵۲]۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز[۵۳] مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو، دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے دربار میں سات سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں[۵۴] جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی کا حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئیں[۵۵] تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس[۵۶] دربار عام والے، مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں[۵۷]، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں[۵۸]، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد[۵۹]، تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم:

---

۵۱ 'اناظر' میں ترتیب کے اعتبار سے پہلا خط ۵۲ خم: 'ہے' کی جگہ 'تھی'

۵۳ خم: 'روزہ' بجائے 'روز' ۵۴ خم: 'ہیں' ندارد

۵۵ خم: '...... ہانسی حصار کا کمشنر ان دونوں کو یہاں لے آیا' ۵۶ خم: 'دربار سے پہلے بس رہے'۔

۵۷ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی (۱۸۰۶ء - ۱۸۶۹ء) غالب کے مخلص دوست، ممدوح اور تلمیذ۔ رک: [تلامذۂ غالب۔ مالک رام ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۰ تا ۱۹۱]

۵۸ مفتی صدرالدین خاں آزردہ (۱۷۸۹ء - ۱۸۶۸ء) مفتیٔ اعظم، صدر الصدور دہلی "ہندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم شخص پیدا کیے ہیں" [تلامذۂ غالب، ص ۸۵]

۵۹ غالب کو دربار کا حق بعہد لارڈ ولیم بنٹنگ (۱۸۲۸ء میں) اور خلعت کا اعزاز لارڈ الن برا کے عہد (۱۸۴۲ء - ۱۸۴۴ء) میں حاصل ہوا [مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم ۱۹۶۴ء ص ۱۰۲]

تو ڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو ، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ جان نثار خان کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم[۶۰] کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سُن جاؤ، غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دُعا، حکیم الملک میر اشرف علی کو دُعا، قطب الملک میر نصیر الدین کو دُعا، یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔[۶۱] غالب

جواب مجروح[۶۲]

قبلہ و کعبہ۔ آداب بجالاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں۔ حضرت دربار نہیں ہوتا نہ ہو۔ پھول والوں کی سیر موقوف ہو گئی، بلا سے۔ گزری نہیں جمتی، چاندنی چوک کی وہ گرمیٔ بازار نہ رہی نہ سہی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، دلّی کی ہستی تو آپ کی ذات پر منحصر ہے۔ جب آپ کو دیکھ لیا سب کو دیکھ لیا۔ اگر غم ہے تو اس کا ہے اور گردشِ روزگار سے شکوہ ہے تو یہ ہے کہ آپ کی قدم بوسی سے محروم رکھا اور ملاقاتِ ہر روزہ سے مایوس کیا۔ نہ کسی کی صحبت خوش آئے نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہے۔

ہر روز وہی ہنگامے پیشِ نظر رہتے ہیں اور وہی یارانِ جلسہ آنکھوں میں پھرتے ہیں۔ ادھر یوسف میرزا غل مچاتے ہیں، اُدھر سے یار عزیز چلے آتے ہیں۔ کسی کونے میں اسد برج کھڑے ہیں، کسی کونے میں میاں موش خاموش بیٹھے ہیں۔ برہما کے پتر کچھ اُلجھ

---

۶۰ خم: 'بولاقی'۔ ۶۱ خم میں وقت، یوم اور تاریخ موجود: مرقومہ صبح جمعہ ۶- جمادی الاوّل، ۲- دسمبر سال حال [۱۲۷۶ھ، ۱۸۵۹ء]

۶۲ 'انا ظر' میں باعتبار ترتیب دوسرا خط۔

کے سبق پڑھ رہے ہیں۔ ادھر ادھر کے لوگ آئے ہوئے اطراف و جوانب کی خبر کہہ رہے ہیں میر احمد حسین میکش[۶۳] شوخی و شقاعت میں لبریز گفتگوئے بین بین میں سرگرم، کسی کے چھیڑنے کے لیے نئی نئی تمہیدیں اُٹھاتے ہیں، کسی کو صاحب و قبلہ کہہ کے پاس بٹھاتے ہیں۔

کیوں حضرت وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیا خوب بسر ہوتی تھی۔ ہر روز ہنسنے بولنے کا ہنگامہ گرم، نہ کوئی اندیشہ نہ کوئی غم۔ اب ان مزوں کا یہ بدلہ ہے کہ ہر ایک کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں اور ہر ایک کی جُدائی میں بن آئے مرتے ہیں۔ نہ یہ اُمید کہ پھر ایک جگہ مل بیٹھیں گے نہ یہ توقع کہ پھر ان صورتوں کو دیکھیں گے۔ اب سیر و تماشا کی آرزو کسے اور وہ دل و دماغ کجا۔ ایسا زمانے نے خاک میں ہمیں ملایا کہ پھر ہنسنے بولنے کی اُمید ہو:

تیرے بے خود جو ہیں سو کیا چیتیں
ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

خدا شاہد ہے کہ پہروں اسی فکر میں پڑا رہتا ہوں کہ پھر بھی وہ دن ہو گا کہ ایک جگہ چار ہم صورت اکٹھے ہوں، کہ یہ چند روز حیات کے، اگر بفراغت نہیں تو بغم ہی بسر ہوں، مگر کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ مسبّب الاسباب ہے، اگر کوئی سبب نکالے تو کیا عجب ہے۔

خیر حضرت یہ رونا تو تمام عمر کا ہے۔ اب غرض یہ ہے کہ نواب گورنر آنے والے ہیں، کچھ آپ کے مقدمہ کی سلسلہ جنبانی ہوئی؟ پنشن ملنے کی صورت نکلی؟ یہ عقدۂ لاینحل بھی کبھی حل ہو گا یا میری خاطر کی طرح منعقد رہے گا۔ میر اشرف علی اور میر نصیرالدین اپنے القابوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تسلیم بصد تعظیم بجالاتے ہیں، سوائے میرن صاحب کے۔ انھوں نے اپنے خطاب سے بہت آنکھ بھوں چڑھائی اور کہا کہ جناب میرزا صاحب قبلہ بھی اُنھیں برائی تشابیہ مستعملہ کا استعمال رکھتے ہیں، جس کی سیکڑوں نے اپنے دوست آشناؤں

---

۶۳ غالب کے شاگرد رشید۔ 'فتح دہلی' کے بعد ۱۸۵۸ء میں پھانسی کی سزا پائی۔

کو نسبت دی ہے، پھر میری خصوصیت کیا ہے اور اس پر بھی مرزا یوسفِ ہند، اگر یوسفِ زمانہ یا یوسفِ کشور لکھتے تو بھی مضائقہ نہ تھا۔ فقط زیادہ حدِ ادب۔ فدوی سید مہدی مجروح[۵۲۴] از دہلی[۵۲۵]۔

نامۂ غالب[۵۲۶]

بے مے نکند در کفِ من خامہ روائی
سرد است ہوا، آتشِ بے دُود کجائی

میر مہدی: صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے، وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب، ہائے غضب!!

میاں، تم پنسن، پنسن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں! ڈپٹی کمشنر، صاحب کمشنر، لفٹنٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو، تو اس کا مرافعہ گورمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل لفٹنٹ گورنر کے ہاں کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے ——— بہرحال جو کچھ ہو گا، تم کو لکھا جائے گا۔

---

[۵۲۴] مجروح کے خط پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ غالب کے جواب منقولہ ذیل کی روشنی میں ا سے ۱۰ دسمبر کے بعد اور ۱۳۔ دسمبر ۱۸۵۹ء سے چند روز پہلے کا خیال کرنا چاہیے۔

[۵۲۵] 'از دہلی'، محلِ نظر ہے۔ 'پانی پت' چاہیے جہاں مجروح انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد چند سے جا رہے تھے۔

[۵۲۶] مجروح کے خط کے جواب میں غالب نے جو خط لکھا وہ 'اَلناظر' میں نقل نہیں ہوا۔ یہاں رخم صفحہ ۳۱۱ و بعد کے حوالے سے درج کیا جاتا ہے۔ مجروح کے خط کے ساتھ غالب کا یہ جواب دوگونہ لطف دیتا ہے

اجی، وہ "یوسف ہند" نہ سہی، "یوسف دہر" سہی، "یوسف عصر" سہی، "یوسف ہفت کشور" سہی - ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ ساڑھے سات روپیہ مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب اس کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں، خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہرحال میرن صاحب کو یہ حال پڑھوا دینا۔

میر سرفراز حسین کو دعا، میر نصیر الدین کو دعا، حکیم اشرف علی کو دعا، "یوسف ہفت کشور" کو دعا۔ سہ شنبہ، ۱۳- دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء

نامۂ غالب[۶۷]

جانِ غالب - تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے[۶۸]

ہر اک سے پوچھتا ہوں، وہ کہاں ہے[۶۹]

مصرعہ بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہو گیا ہے - اے میر مہدی، تجھے یہ کہتے[۷۰] شرم نہیں آتی:

میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے

اہلِ دہلی یا[۷۱] ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں

---

۶۷ 'الناظر' میں باعتبارِ ترتیب چھٹا خط

۶۸ مجروح کے دیوان 'مظہرِ معانی' طبع اوّل سرفراز پریس دہلی (ص ۱۶۷ - ۱۶۸) میں سترہ اشعار کی یہ غزل موجود ہے۔

۶۹ شعر یہ ہے: نہیں لیتا ہوں فرطِ رشک سے نام
ہر اک سے پوچھتا ہوں، وہ کہاں ہے

۷۰ خم: 'یہ کہتے' ندارد

۷۱ خم: " ارے، اب اہلِ دہلی "

سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے[۴۲]۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

سنو[۴۳] خس کی ٹٹی، پُروا ہوا، اب کہاں۔ وہ لطف تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگزرد۔ مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ کھاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجدِ جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجدِ جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو میرزا گوہر کے باغیچے کے اُس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب[۴۴] کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک ایک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی[۴۵] واڑہ، رام جی داس گنج[۴۶]، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا

---

[۴۲] اس پر مجروح نے شعر بدل کر مقطع کو یوں بنا دیا:

سخن گو یوں تو اک عالم ہے مجروح
مرے اُستاد کی پر کیا زباں ہے!

[۴۳] خم: "سنو" ندارد۔

[۴۴] خم: "اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے....."

[۴۵] خم: دھوبی

[۴۶] خم: رام جی گنج

تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ، دلّی نہ رہی اور دلّی والے تک میاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حُسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟

دلّی، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ نہر رہے نام اللہ کا[۸۴]۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الیگزنڈر ہدرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً اُن کی مصاحبت نہیں، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب[۸۵] کو دعا۔ ۱۸۶۱ء

جواب مجروح[۸۶]

قبلہ و کعبہ، آداب بجا لاتا ہوں۔ بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے، اگر شرم آئے تو رجب علی سرور کو آئے، جس نے وہ لاف و گزاف کیا ہے کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں۔ اُن سے کہا چاہیے کہ ارے مردِ خدا، خدا سے ڈر۔ لکھنؤ کس بادشاہ کا دار الخلافہ رہا ہے، کون سی تاریخ میں وہاں کے لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے؟ ماہیت تو اس کی یہ ہی ہے نا کہ مضافاتِ صوبۂ اودھ میں کا ایک شہر ہے۔ یہ دلّی سے کیوں کر مقابلہ کرے گا کہ اگر پانچ سو برس کی تصنیفات دیکھو گے اُس میں سے یہی لکھا پاؤ گے:

حضرتِ دہلی کنفِ عدل و داد　　جنّتِ عدن است کہ آباد باد

اُس پر یہ غرّہ کہ جو یہاں کی زبان ہے وہ کہیں کی نہیں۔ باوجودیکہ تفاخراً یہ شعر ناسخ نے لکھا ہے:

---

[۸۴] خم: "رہے نام اللہ کا" ندارد　[۸۵] خم: میرن صاحب مقدم، نصیر الدین مؤخر
[۸۶] 'انا ظ' میں ترتیب کے اعتبار سے ساتواں خط

سُن چکے ہیں خوب اُردوئے معلّیٰ کی زباں
سالہا صحبت رہی ہے ہم کو تاسخ میر سے

اور یہ بات ظاہر ہے کہ میر، دلّی کے تھے۔ مگر افسوس کہ ان کے پیرو اس بات پر خیال نہیں کرتے۔

اے حضرت، میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کو وہاں کی کون سی ایسی بات پسند آئی کہ ایسی طرفداری فرمائی۔ قطع نظر زبان سے، تراش و خراش لباس بھی وہاں کی نرالی ہے۔ واہ ری دلّی، تیرے قربان، کیا حدِ اوسط پر سب کا عمل تھا کہ سب چیز افراط و تفریط سے مائل بحدِ وسط تھی۔ کیوں نہ ہو، خیرالامور اوسطہا پر سب کا عمل تھا۔

بھلا حضرت، یہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ وہاں سب طرح کے اہلِ کمال موجود ہیں۔ بھلا دلّی سے بھی زیادہ کہیں اہلِ کمال ہوں گے۔ میاں امیر کے برابر لکھنؤ میں کون سا خوش نویس تھا؟ حضرت غالب کی سی نظم و نثر کس کی؟ امام الدین خاں سا حکیم، مولانا صدرالدین خاں سا عالم، محمد اعظم سا مصوّر، بدرالدین خاں سا مہر کند کہاں ہے۔ دستنبو کی طرح نواب گورنر بہادر نے کس کی تصنیف طلب کی۔ بدرالدین خاں کے مانند ملکۂ معظمہ کی مہر کھُدنے لکھنؤ میں کون سے مہر کند کے پاس آئی۔ خانم کے بازار کے دو کاریگر جنہوں نے انگریزی اسباب بدل ڈالا اور نہ کسی کو معلوم ہوا، یہ لوگ کہاں؟ گو دلّی اب اُجڑ گئی اور سارا شہر برباد ہو گیا، مگر اُس شہر سے جس کی تعریف میں پہلے ہی میر حسن، صاحب مثنوی یہ فرما گئے ہیں، بہتر ہی ہے:

زبس یہ شہر ہے بیہڑ پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پہ گھر ہوا ہیں — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
سیہ گل سے گل یوں تر رہے ہے — بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے

اگر دلّی کی شہریت اور خوش قطعی کی تعریف کروں تو ایک کتاب بن جائے،

خط سمجھ کر موقوف کیا۔ فقط[۴۹]

میر مہدی مجروح

جواب الجواب از غالب[۵۰]

او میاں سید زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کے بُرا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم[۵۱] نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں! ذوق کہاں! مومن خاں کہاں! ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بےخود و مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی، وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

سنو صاحب، پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں، ولد سردار خاں، ولد دلاور خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے، غلام حسین خاں ولد مصاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح و مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ لیاقتِ ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ — بھائی، خوب چھان کر لکھو اور جلد لکھو۔ پنجشنبہ، ۲۳- مئی ۱۸۶۱ء

غالب

---

۴۹ غالب کے اگلے پچھلے خطوں کی روشنی میں اس خط کو مئی ۱۸۶۱ء کا خیال کرنا چاہیے۔

۵۰ اُردوئے معلّیٰ میں باعتبارِ ترتیب پانچواں خط

۵۱ خم: 'آزرم' بجائے 'آرزو'۔

قطعۂ غالب

"درخصوص گفتگوی پارس انشا کردہ است"

غالب کی کتاب "قاطع برہان"[1] (۱۸۶۲ء) کے جواب میں مولوی آغا احمد علی متخلص بہ احمد کی ایک ضخیم کتاب "مؤید برہان" ٹائپ میں ۴۶۸ صفحات کو محیط، مطبع مظہر العجائب محلہ تل تلا، واقع کلکتہ سے ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔

"مؤید برہان" غالب کی نظر سے ابھی گذری بھی نہیں تھی اور اس کے بارے میں کلکتے کے کسی دوست سے محض اطلاع ہی ملی تھی کہ غالب نے اکتیس ۳۱ اشعار کا ایک فارسی قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کلکتے روانہ کر دیا۔ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کو اس امر کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے شاگرد منشی حبیب اللہ ذکا، کو لکھتے ہیں:

"صاحب! میں بعین عنایت الٰہی، کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس، مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اُس کا "مؤید برہان"، اُس رسالے میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراضات جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق، اس دوست کو، دو چار جلدیں "درفش کاویانی" علاوہ اوراق

---

[1] طبع اول: مطبع نولکشور اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۱ مارچ ۱۸۶۲ء، صفحات ۹۸

مذکورہ بھیج دیے۔ اُسی زمانے میں تین چار ورق خوب یاد ہے کہ "درفش" کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں، یا تو مجھے غلط یاد ہے یا تم نے "درفش" کو کھول کر دیکھا نہیں، وہ اوراق مع "درفش" زینتِ طاقِ نسیاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں اپنے نزدیک مکرر بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحبزادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی یہی ہے اور بس۔۔۔۔"

[اُردوئے معلّٰی، طبع اوّل، دہلی مارچ ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۴]

اس سے پہلے ۴۔ دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں بھی ذکاء سے پوچھ چکے ہیں کہ:

"پہلے تو یہ کہو کہ "درفش کاویانی" اور وہ قطعہ جس کی پہلی بیت یہ ہے:

مولوی احمد علی، احمد تخلّص نسخہ

در خصوصِ گفتگوی پارس انشا کردہ است

تم کو پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر پہنچا تو مجھ کو رسید کیوں نہ لکھی۔ اگر یہ پارسل پہنچ گیا ہے تو رسید لکھو اور دیباچۂ ثانی جدید[۵۲] کی داد دو اور اگر نہیں پہنچا تو مجھ کو اطلاع دو تاکہ ایک نسخہ اور بھیجوں۔" [اُردوئے معلّٰی، طبع اوّل، صفحہ ۴۲]

گویا "قطعۂ غالب" پر مشتمل ورق ۴۔ دسمبر ۱۸۶۶ء سے پہلے چھپ گیا تھا۔

غالب کے خطوط میں "قطعۂ غالب" کا ذکر ان دو حوالوں کے علاوہ اور کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن ایک اور مآخذ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "قطعۂ غالب" کم از کم اگست ۱۸۶۶ء سے پہلے ضرور چھپ چکا تھا۔

یہ ادّعا کچھ تفصیل چاہتا ہے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر، غالب کے عزیز دوست تھے۔ انھوں نے مطبع مجتبائی، میرٹھ کے منشی ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش پر غالب

---

۵۲ یہ "قاطعِ برہان" کے "دیباچۂ ثانی جدید" کی داد چاہی جا رہی ہے جو "درفش کاویانی" کے ساتھ شائع ہوا۔

کے رقعات کا مجموعہ "عودِ ہندی" مرتب کیا تھا۔ اس کی ترتیب سے فراغت پاکر انھوں نے غالب کو ایک خط لکھا جس میں "مؤید برہان" کا بھی ذکر ہے۔ یہ خط محفوظ ہے۔ بے خبر کے اس خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"جناب عالی، میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے، آپ کو بھیجا ہے۔ اس میں یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اور وہ کہاں چھپا ہے، آج تک جواب نہیں۔ کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو جب ترکِ جواب آپ کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجیے، مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجیے۔ الحمد للہ کہ "عودِ ہندی" کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بندھوا کر آج منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی ہے۔ اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی، انھیں اختیار ہے۔"

[انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱ وما بعد]

"قطعۂ غالب" مطبوعہ کی پیشانی کی عبارت یہ ہے:

"قطعہ در گذارش سپاس یادآوری بعالی خدمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری۔"

اور پورے قطعے میں مولوی احمد علی جہانگیر نگری کے نسخے "مؤید برہان" کا نام کہیں نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مطبوعہ قطعے کا ورق غالب نے بے خبر کو بھیجا ہوگا، اس پر یہ قدرتی امر ہے کہ بے خبر کے دل میں مولوی صاحب کے رسالے کا نام جاننے کا تجسس پیدا ہوا، اور انھوں نے غالب سے پوچھا کہ اس رسالے کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے؟ اس استفسار میں رسالے کو دیکھنے اور پڑھنے کا اشتیاق پنہاں ہے۔ غالب کو یہ بات پسند نہ آئی ہوگی، اس لیے انھوں نے اس کے جواب سے صرفِ نظر کیا۔

بے خبر کے اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ہے یہ ۱۸۶۶ء یا اس کے لگ بھگ

کا، کیونکہ "مؤید برہان" ۱۸۶۶ء میں چھپی ہے۔ مگر ایک دوسرے ذریعے سے ۱۸۶۶ء سنہ عیسوی کے ساتھ ساتھ، بے خبر کے اس خط کے زمانۂ تحریر کا نسبتاً زیادہ متعین طور پر پتہ چل جاتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۶، اگست ۱۸۶۶ء کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> "مولوی غلام غوث خاں، میر منشی نے ۔ ۔ ۔ میرا مجموعۂ نثر (عودِ ہندی) مرتب کرکے منشی ممتاز علی خاں [کو] بھیج دیا ہے۔ اب چھپوانے میں اُن کو اختیار ہے۔"
> [علی گڑھ میگزین، غالب نمبر: ۴۹-۱۹۴۸ء صفحہ ۹۷]

غالب کا ۲۶، اگست ۱۸۶۶ء کا یہ خط گویا، بے خبر کے محولہ بالا خط کے بعد کا ہے، چونکہ اسی میں بے خبر نے غالب کو اس امرِ خاص سے مطلع کیا تھا اور مطلع بھی کم و بیش انھی لفظوں میں کیا تھا۔ بے خبر کے خط کا یہ ٹکڑا "آج تک جواب نہیں" اس امر پر مظہر ہے کہ مولوی احمد علی جہانگیر نگری کے بارے میں استفسار کیے، گویا بہت دن ہو چکے۔ اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ بے خبر کو "قطعۂ غالب" ۲۶، اگست ۱۸۶۶ء سے خاصا پہلے مل چکا تھا اور بظاہر قطعے کا ورق، اس وقت تک چھپ چکا ہوگا، تو ہی بے خبر کو پہنچا ہوگا۔

مختصر یہ کہ قطعہ غالب کا اگست ۱۸۶۶ء سے قبل چھپنا طے پاتا ہے۔ اکتیس اشعار تو ہیں ہی، یہ ایک ورق پر اوّل رُخ ہی آگئے۔ ورق کی تقطیع ½۱۲×۸ انچ ہے لیکن جومن کی پیمائش ۱۱×½۶ انچ ہے۔ خوش نویس بہت با مذاق معلوم ہوتا ہے، اس نے ان اشعار کو تین کالموں میں سلیقے سے ترچھا لکھا ہے اور کالموں کو خوش وضعی سے ترتیب دیا ہے۔ بیلدار گوشے علاوہ ہیں۔ قطعہ کے عنوان کی عبارت یہ ہے:

> "قطعہ در گذارش سپاس یاد آوری بعالی خدمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری"
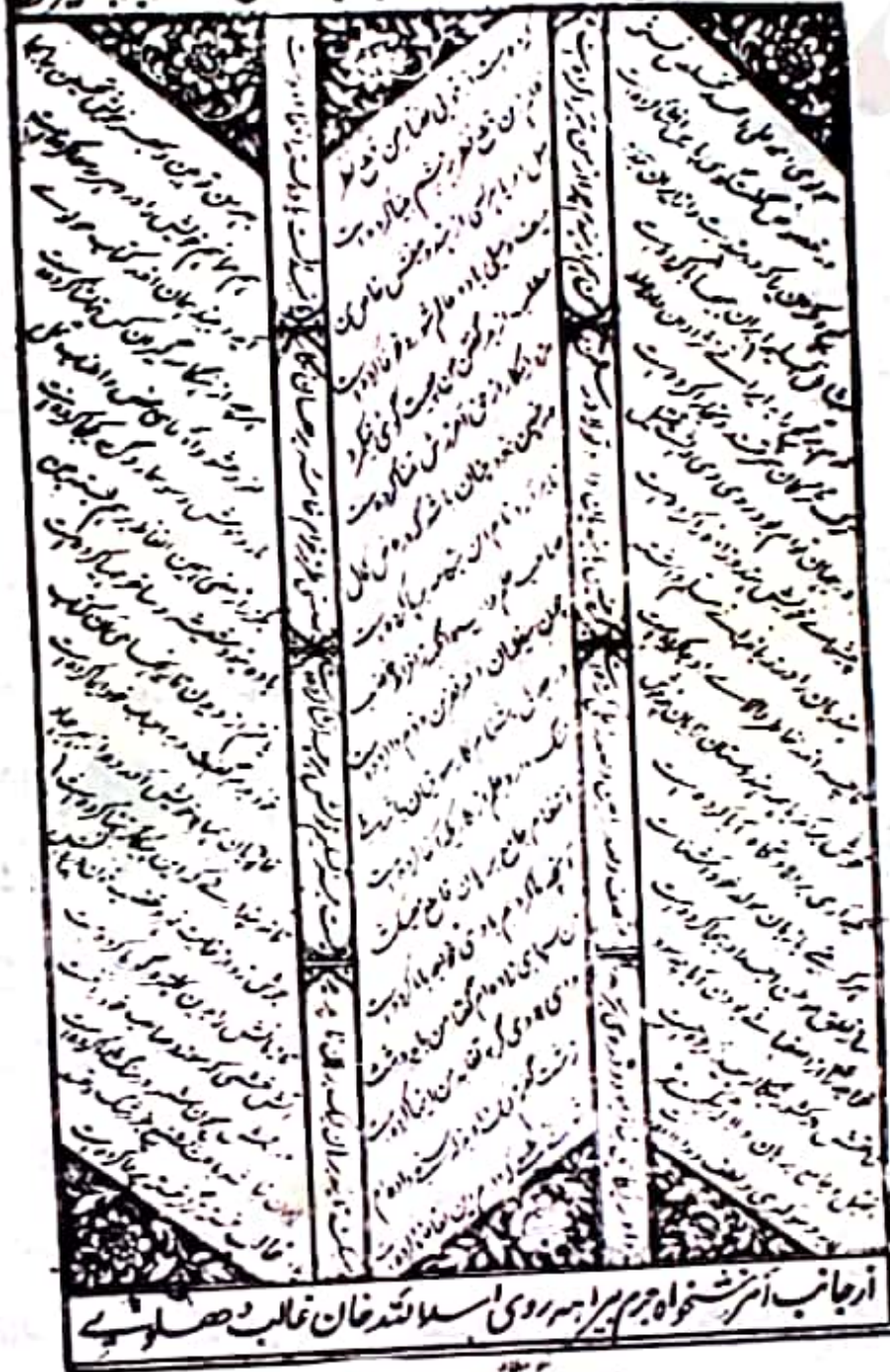
ترقیمہ یہ ہے:

"از جانب آمرزش خواجہ جرم بیراہہ روی اسداللہ خاں غالب دہلوی"

اکمل المطابع

ڈاکٹر مختار الدین احمد کے بقول: "غالب نے یہ قطعہ ایک علاحدہ ورق پر اس لیے چھپوایا تھا کہ احباب و تلامذہ اور دوسرے اہلِ علم میں آسانی سے تقسیم کرایا جا سکے"۔
[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۵]

غالب کا یہ قطعہ "کلیاتِ غالب" (فارسی) کی طباعت (۱۸۶۳ء) کے بعد لیکن "سبدِ چین" (اگست ۱۸۶۷ء) سے قبل موزوں ہوا، اس لیے قدرتی طور پر "کلیات" سے خارج لیکن "سبدِ چین" میں شامل ہے۔ غالب کی زندگی میں یہ قطعہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے حصہ اول (اپریل ۱۸۶۷ء) میں بھی شائع ہوا۔ اس قطعۂ غالب کا عنوان مالک رام کی مرتبہ "سبدِ چین" (دہلی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۹-۵۱) میں "قطعہ بست و ششم" ہے۔ یہ قطعہ غالب کی آخری ادبی یادگار "باغِ دو در" (۶۷-۱۸۶۶ء) مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، (لاہور، ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۹-۲۲) میں بھی موجود ہے۔ حالی نے "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) میں اس قطعے کے پندرہ شعر درج کیے ہیں (یادگارِ غالب، مطبع ریاضِ ہند، علی گڑھ، صفحہ ۴۵-۴۶)۔ مولانا غلام رسول مہر نے اسے اپنی تالیف "غالب" میں نقل کر دیا ہے (طبع اول ۱۹۲۶ء، صفحہ ۲۴۹-۲۵۰)۔ سہ ماہی "اُردو" شمارہ جنوری ۱۹۲۷ء میں بھی یہ قطعہ بھی چھپ چکا ہے۔

'غالب صدی' کے موقع پر یہ قطعہ مندرجہ ذیل تین چار مجموعوں میں راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے:

در: قطعات، رباعیات ... غالب، صفحہ ۱۱۵-۱۱۸، مولانا غلام رسول مہر
لاہور، ۱۹۶۹ء

در: سبدِ چین، صفحہ ۹۴-۹۷، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

در : ہنگامۂ دل آشوب، صفحہ ۴۴-۴۷ سید قدرت نقوی، کراچی ۱۹۶۹ء

در : علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء متعارفہ : مختارالدین احمد مقابل صفحہ ۴۰

ڈاکٹر مختارالدین احمد کا خیال ہے کہ :

"قطعۂ غالب" مطبوعہ، غالب نے کثرت سے اطراف وجوانب میں بھیجا ہوگا، لیکن اب بے حد کمیاب ہے۔ ہندوستان کے کسی کتاب خانے میں راقم کے نظر سے نہیں گذرا۔ انڈیا آفس لائبریری میں یہ ورق موجود ہے اور غالباً مالک رام صاحب کے پاس بھی یہ قطعہ محفوظ ہے"۔

[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۷]

رام پور سے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ :

"قطعۂ غالب" کی ایک کاپی رامپور رضا لائبریری میں بھی موجود ہے جو غالب نے نواب رام پور کو بھیجی تھی اور غالباً نہیں بلکہ یقیناً یہ قطعہ مالک رام صاحب کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں بھی محفوظ ہے"۔

[بنام راقم الحروف : ۶ مئی ۱۹۶۹ء]

"قطعۂ غالب" (جداگانہ)، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی موجود ہے جس کا نمبر : ضمیمہ یونیورسٹی ۲۶۵ ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ :

"مرزا نے اکتیس شعر کا ایک فارسی قطعہ مولوی احمد علی کے نام لکھ کر بھیجا، جس میں ان کی کتاب (مؤید برہان) پر بڑے پر اثر طریقے میں نکتہ چینی کی ہے"۔

[غالب نامہ : آثار غالب، طبع چہارم بمبئی، صفحہ ۱۷۴]

مولانا غلام رسول مہر کا ارشاد ہے کہ:

"مؤید برہان" کے جواب میں غالب نے فارسی میں ایک قطعہ لکھا جس میں اگرچہ کل اکتیس شعر تھے لیکن "مؤید" جیسی دس کتابیں بھی اس کی تاثیر جہانگیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔[۵۲]"

[غالب، طبع دوم، لاہور ۱۹۴۱ء، صفحہ ۴۴۲]

لیکن اس پُر اثر طریقے میں "نکتہ چینی" اور "مؤید برہان" کے اس جواب کی "تاثیر جہانگیر" کی وقعت کیا رہ جاتی ہے، جب یہ حقیقت علم میں آجائے کہ اس "جواب اور نکتہ چینی" کی تحریر و تعزیر کے وقت تک غالب نے "مؤید برہان" کو سرے سے دیکھا تک بھی نہیں تھا۔[۵۳] اور محض کلکتے کے ایک دوست کی اطلاع پر کہ "قاطع برہان" کے جواب میں ایک کتاب لکھی گئی ہے، انھوں نے قطعہ لکھ کر اسے شائع بھی کر دیا۔

"۔۔۔ ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی، مدرس، مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے نام اس کا "مؤید برہان" اس رسالے میں دفع کیے ہیں۔ تیرے وہ اعتراضات جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی! میں نے اتنے علم

---

۵۲ سید قدرت نقوی نے مولانا مہر کی اسی بات کو اڑا لیا ہے:

" غالب کا یہ فارسی قطعہ اکتیس شعروں کا ہے مگر درحقیقت "مؤید برہان" جیسی کئی کتابیں بھی حسن تاثیر میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔۔۔"

[ہنگامۂ دل آشوب، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۲]

۵۳ اغلب یہ ہے کہ "مؤید برہان" غالب کے پاس مارچ ۱۸۶۶ء میں پہنچی، دیکھیے حبیب اللہ ذکا کے نام غالب کا خط مرقومہ ۱۲۔ مارچ ۱۸۶۶ء [اردوئے معلیٰ، طبع اول ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۰]

پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق .... اس دوست کو .... بھیج دیے ....:"

[بنام حبیب اللہ ذکا : ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء]

کتاب دیکھی تک نہیں۔ لیکن اس کی تغلیط میں رواں ہیں اور صاحب کتاب کی تنقیص میں لکھتے ہیں کہ مولوی احمد علی متخلص بہ احمد نے ارض کیچ و مکران کو جو "ہند و سند" میں ہے اور ایران سے جدا ہے، بلا تکلف اقلیم ایران میں شامل جانا ہے اور یہاں کی اقوام کو خلط ملط کر دیا ہے اور سمرقند و بخارا کے ترکوں پر ایک ہندو زادے قتیل کو ترجیح دی ہے:

مولوی احمد علی ، احمد تخلص نسخہ ٔ
در خصوص گفتگوی پارس انشا کردہ است
کیچ و مکران را کہ در سند است و از ایران جدا
شامل اقلیم ایران بے محابا کردہ است
قوم برلچ را با ایرانی نژادان دادہ خلط
ترکِ ترکانِ سمرقند و بخارا کردہ است
در جہان توام بود روی وی پشت قتیل
پیشوای خویش ہندو زادۂ را کردہ است
ہندیان را در زباندانی مسلم داشتہ
تا چہ اندر خاطرِ والای او جا کردہ است

کتاب، خود دیکھی تک نہیں ہے لیکن اس کے مندرجات اور طرزِ استدلال پر معترض اور مؤلف کتاب مولوی آغا احمد علی سے ناانصافی اور بدکلامی کے شاکی ہیں کہ انھوں نے میری خوبیِ گفتار سے دانستہ صرفِ نظر کیا ہے اور مجھے برا بھلا کہا ہے۔ وہ ہندی نژاد قتیل، جامع برہان (محمد حسین) اور صاحب بہار عجم (ٹیک چند) کے عاشق زار ہیں، مجھ سے کیوں بیزار ہیں:

با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند
لابۂ و سوگیری و لطف و مدارا کردہ است
داوری گاہے بنا فرمود، در وے بہرسہ را
منصف و صدرِ امین و صدرِ اعلیٰ کردہ است
گرچنین با ہندیان دارد تولا در سخن
من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است
کردہ است از خوبیٔ گفتارِ من قطعِ نظر
ظلم زین قطعِ نظر بر چشمِ بینا کردہ است
میلِ او با ہر کسے از ہند و حیفش خاصِ من
حیف و میلے با دو عالم شور و غوغا کردہ است
مطلب از بدگفتنِ من چیست؟ گوئی نیک مرد
مزدِ ایں کار از حق آمرزش تمنا کردہ است
ورچنین نبود، چنان باشد کہ در عرضِ کمال
تا برآرد نام، ایں ہنگامہ برپا کردہ است

بار بار کہنا پڑتا ہے کہ کتاب، غالب کی نظر سے گذری تک نہیں ہے لیکن "تبصرہ" حاضر ہے! مؤلف کتاب مولوی آغا احمد علی، احمد کی کم علمی پر ماتم کرتے ہیں، ان کو جانبداری اور بدنیتی کا مستلزم قرار دیتے ہیں اور ان کی روشِ تحریر کا مضحکہ اڑاتے ہیں کہ مولوی احمد علی نے "برہانِ قاطع" کی تائید کی ہے لیکن برہان و دلائل کا فقدان ہے۔ صاحب برہان کے طرزِ انشار کی کمزوری کو جانتے نہیں یا دانستہ اُسے چھپایا ہے۔ میری توہین اور اپنی تحسین کرکے مجھے بھی اپنے ساتھ عالم میں رسوا کیا ہے۔ مولوی احمد علی کی کتاب کو بے لاگ ہوکر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ معائب سے پُر، لغو و حشو سے عبارت ہے، پھر بے دلیل

دعوے اور ملول و دلگیر کر دینے والی طوالت۔ معنی سے قطع نظر الفاظ کو دیکھیے تو ظاہر ہے کہ شراب تو ہے نہیں مگر شیشہ و ساغر مہیا کر دیے ہیں۔

وہی بات کہ کتاب ہی ابھی مطالعے کے لیے انھیں میسر نہیں آئی تھی،[۵۹] کتاب کی تقریظیں اور تاریخیں دیکھنے کی بات تو بعد کی تھی لیکن فرماتے ہیں کہ کتاب کے قطعاتِ تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے خود بھی بُرا کہا ہے اور اس کے لیے اپنے دوستوں کو بھی اُبھارا ہے گویا اس "کارِ خیر" میں تنہا نہیں ہیں، ایک جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انتہائے جوش و غضب میں دل کھول اٹھا ہے، اسی لیے یہ بیہودہ روش روا رکھی ہے۔ غصے کی آگ، اوّل صاحبِ قہر کو جلاتی ہے، یہی باعث ہے کہ مولوی احمد علی کے دل میں شرارے بھرے ہوئے ہیں، ورنہ رشک و حسد کے بجز اور کوئی بات بُرا بھلا کہنے کی نہیں:

یافتم از دیدنِ تاریخہای آں کتاب
خود بدم گفت و باحبابِ خود ایما کردہ است
غازیان ہمراہِ خویش آوردہ از بہرِ جہاد
تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است
جوش زد از غایتِ قہر و غضب خون در دلش
تا زبانش را بدین کُلپترہ گویا کردہ است
آتشِ خشمے کہ سوزد صاحبِ خود را نخست
در دلش ہمچوں شرر در سنگ ماوا کردہ است
چوں نہ باشد باعثِ تشنیع جز رشک و حسد
باد غالب خستہ تر، گر خستہ پروا کردہ است

---

۵۹ کتاب "مؤید برہان" غالب کے پاس مارچ ۱۸۶۷ء میں پہنچی جبکہ "قطعۂ غالب" اس کتاب کے دیکھنے سے کم از کم چھ سات مہینے پہلے اگست ۱۸۶۶ء میں یا اس سے بھی پہلے کسی وقت موزوں ہوا ہے۔

کتاب "مؤید برہان" کے بارے میں محض اطلاع ملی ہے کہ اس میں مولوی احمد علی نے صاحب برہان پر کیے گئے غالب کے اعتراضات "دفع" کیے ہیں اور کچھ اعتراضات غالب پر "وارد" بھی کیے ہیں۔ بس اس اطلاع کی بنیاد ہی پر رقم طراز ہیں کہ مجھ سے جامع "قاطع برہان" کا انتقام لیا گیا ہے۔

اس موقع پر ایک بات ضرور ہوئی کہ غالب نے اپنی درشت گفتار اور زشت گوئی کا اقرار کیا ہے، لیکن یہ اعتراف برملا نہیں، حسنِ گفتار کے پردے میں اور امر لابد کے طور پر ہے یعنی کچھ اس انداز میں کہ میں تو سپاہی زادہ تھا، میری گفتار کچھ درشت ہونی ہی تھی، لیکن افسوس کہ خاص اس معاملے میں میری تقلید کی گئی! زشت گوئی سے کام لیا ہے، اس کے معترف ہیں، بایں ہمہ بذلہ سنجی کی داد چاہتے ہیں! یہ طبع شوخ کی ادا بھی ہے اور اس کا اقتضا بھی:

انتقامِ جامعِ "بُرہانِ قاطع" می کشد
آنچہ ما کردیم با وی، خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام، گفتارِ من باید درشت
وائے بروے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم، لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام
شوخیِ طبعے کہ دارم این تقاضا کردہ است

ان اشعار کے حوالے سے شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ "جو شوخ فقرے، خود غالب نے صاحبِ بُرہان کی نسبت لکھے تھے، ان کی بڑے لطف سے توضیح کی گئی ہے[۵۵]۔"

"مؤید بُرہان" کے مصنف آغا احمد علی[۵۶] احمد کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں فارسی کے

---

[۵۵] غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، ابمبئی، صفحہ ۱۷۲ و ما بعد۔

[۵۶] مولوی احمد علی نے سنہ ۱۲۸۰ ف میں انتقال کیا (تاریخ لطیف، مصنفہ مہدی علی خاں) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مدرس تھے۔ ان کے اجداد اصفہانی الاصل تھے لیکن ایک زمانے سے نقل مکان کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ خود ان کا مولد ومنشا کا (جہانگیر نگر) تھا اسی لیے جہانگیرنگری کہلاتے تھے[۵۸] آغا احمد علی ایرانی النسل ہونے کے دعویدار تھے۔ غالب اس دعوے کو نہیں مانتے۔ لکھتے ہیں کہ:

ہندیان را در زباندانی مسلّم داشتہ
تا چہ اندر خاطرِ والای او جا کردہ است
خوش برآمد با ہمہ ہندوستان زایان چہ خوش!
تکیہ آرے بر ولادت گاہِ آبا کردہ است
ہر کہ بینی با زبانِ مولدِ خود آشناست
سازِ نطقِ موطنِ اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود؟
خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است

اکرام صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "مرزا غالب کا یہ دعویٰ تو کسی طرح قابلِ قبول نہیں کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود آغا احمد علی کو اہلِ زبان نہ سمجھا جائے۔ لیکن مرزا غالب، باوجودیکہ نہ ان کے آبا ایران سے آئے، نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے، اہلِ زبان گنے جائیں[۵۹]"

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) تحویلدار کتب خانہ (ص ۱۵)۔ یہ سال فصلی سنہ ۱۲۹۰ ہجری اور سنہ ۱۸۷۲ء عیسوی کے مطابق ہوگا۔ (تشریح السنین قلمی صفحہ ۱۰۹، فن ہیئت اردو نمبر ۱)

[امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب، طبع اوّل ۱۹۳۷ء، حاشیہ متن صفحہ ۴۲]

۵۸ مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، صفحہ ۲۲۱

۵۹ غالب نامہ: آثار غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۰۵

"فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں' ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو' چار سو' آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں...."

[نامۂ غالب' بنام تفتہ: ۲۷ اگست ۱۸۶۲ء]

* * *

"میں اگر اتنی دیر بعد پیدا ہوا ہوں تو یہ میرے لیے فخر و عزت کا مقام ہے کیوں کہ اس طرح مجھے مبداء فیض سے اتنی مدت زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملا اور میری استعداد و قابلیت بھی اسی نسبت سے زیادہ ہے:

باخذ فیض ز مبداء فزونم از اسلاف
کہ بودہ ام قدرے دیر تر بداں درگاہ
نزول من بہ جہاں بعد یک ہزار و دویست
ظہورِ خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

[ذکرِ غالب' مالک رام' طبع چہارم' ۱۹۶۴ء: صفحہ ۲۹۵]

* * *

"مبداء فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کی منطق کے بھی فرہ ایزدی لایا ہوں...."

[نامۂ غالب' بنام مفتی سید محمد عباس: ۱۶۔ اگست ۱۸۶۲ء]

* * *

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس[2] رہا اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ ۔ ۔ ۔"

[نامۂ غالب، بنام نواب کلب علی خاں: ۷۔ اکتوبر ۱۸۶۶ء]

* * *

"فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للہ الحمد و للہ الشکر۔"

[نامۂ غالب، بنام تفتہ: ۲۷۔ اگست ۱۸۶۲ء]

* * *

"شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر اور ہندوستانیوں کو مسلم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے۔ سو، میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران (ماوراءالنہر) سے آیا تھا اور میرا باپ دلی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں خود کو اہلِ زبان سمجھتا ہوں۔ میں بلاشبہ زبان دان ہوں اور میری زباندانی اوّلاً خداداد سلامتی طبع کی بدولت ہے

---

۲ "مجھے اس میں شک ہے کہ ۔ ۔ ۔ کوئی پارسی اکبرآباد آیا اور میرزا صاحب اس کے شاگرد ہوئے اور وہ دو برس میں انہیں فارسی سکھا کر چلا گیا۔ بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کو خاموش کرنے کے لیے میرزا صاحب نے یہ (قصہ) دل سے گھڑ لیا تھا جیسا کہ حالی نے خود میرزا غالب ہی کی زبانی 'یادگارِ غالب' میں اس کا ذکر کیا ہے۔۔۔۔" [مولانا امتیاز علی عرشی، حواشی مکاتیب غالب، طبع دوم ۱۹۴۲ء، صفحہ ۲] عرشی صاحب کی رائے سے کلی اتفاق نہ بھی کیا جائے تو اتنا ضرور یقینی ہے کہ یہ امر اختلافی ضرور ہے۔

جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرتاً مناسب واقع ہوئی ہے، تیسرے ہرمزد کے فیض صحبت سے جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا۔"

[ورفش کاویانی، طبع اول، صفحہ ۱۲۱، ترجمہ حالی از یادگار غالب]

* * *

" اگر مجھ سے کوئی کہے کہ " غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے" میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے :

ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم از آن جملہ زبانم دادند

زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ ہے اور یہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے"

[نامۂ غالب، بنام میرزا رحیم بیگ میرٹھی : ۱۸۶۵ء]

شیخ محمد اکرام ہی کے بقول" اسے بھلا سوائے غالب کے معتقدین کے کوئی کیسے مانتا (کہ باوجودیکہ نہ ان کے آبا ایران سے آئے، نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے، انہیں اہلِ زبان گنا اور مانا جائے) اور واقعہ یہ ہے کہ مرزا نے ہندی نژاد فارسی نویسوں پر جو اعتراض کیے ہیں، اگر کوئی اہل زبان کرتا تو لوگ اتنے برافروختہ نہ ہوتے۔ لیکن چونکہ مرزا خود ہندی نژاد اور ترکی النسل تھے، ان کا دعویٰ برتری کوئی نہیں مانتا تھا۔"

[غالب نامہ آثار غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۶۹]

" قطعۂ غالب" مباحثۂ برہان کے سلسلے کی پہلی منظوم چیز تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اس پر " قاطع برہان کے نتیجے میں چھڑی ہوئی" ادبی جنگ نے نثر کے بجائے نظم کی شکل اختیار کرلی اور غالب ہی کی زمین میں موافق و مخالف (مولانا غلام رسول مہر کی شمار بندی کے مطابق)

چار سو تیرہ شریک کئے[1] اور ان نظموں نے بترتیب ذیل تین رسالوں کی صورت اختیار کی

۱- ہنگامۂ دل آشوب (سولہ صفحات): در مطبع منشی سنت پرشاد واقع آرہ ضلع شاہ آباد، بہار، ۵ ذی الحج ۱۲۸۲ھ/۱۱ اپریل ۱۸۶۶ء

۲- تیغِ تیز تر (سولہ صفحات): در مطبع غلام نبی خان، مطبع نبوی، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء

۳- ہنگامۂ دل آشوب (حصہ دوم): ۴۴ صفحات: در مطبع منشی سنت پرشاد واقع آرہ ضلع شاہ آباد، بہار، ۲۵ جمادی الاول ۱۲۸۴ھ/۲۴ ستمبر ۱۸۶۷ء

مالک رام کے بقول "اس شعری مناقشے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ منشی محمد امیر لکھنوی کے قطعے کے علاوہ جو اردو میں ہے، باقی تمام قطعات فارسی میں اور اسی زمین میں لکھے گئے: انتشار کردہ است تقاضا کردہ است (ذکرِ غالب طبع چہارم ۲۴۴)" ہنگامۂ دل آشوب کے دوسرے حصے میں غالب کی حمایت میں دو نثری مضامین: ایک اردو (سخن دہلوی) اور ایک فارسی (باقر آرزوی) بھی شامل ہیں۔

[جشن نامہ یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، دسمبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۱۱-۲۲۹]

اضافہ:

اس مقالے کی اشاعت (دسمبر ۱۹۶۲ء) کے بعد ایک حوالہ نظر سے گزرا، جس سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ قطعہ اگست ۱۸۶۶ء سے پہلے چھپ چکا تھا اور غالب نے اس کی چھپی ہوئی دس کاپیاں ۲۱ جولائی ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں کو بھیجی تھیں جو دارالانشا، رامپور میں محفوظ ہیں۔ رجوع کیجیے:

۱- مکاتیب غالب، امتیاز علی عرشی، طبع اوّل ۱۹۳۷ء، متن صفحہ ۷۵

۲- مکاتیبِ غالب، امتیاز علی عرشی، طبع دوم ۱۹۴۳ء، متن صفحہ ۵۴-۵۵

○

---

[1] غالب، طبع چہارم، لاہور ۱۹۴۶ء، صفحہ ۲۴۴

عودِ ہندی

غالب کے اُردو خطوں کا پہلا مجموعہ

وسط نومبر ۱۸۵۸ء میں منشی شیو نرائن آرام نے جو آگرے میں ایک مطبع کے مالک اور غالب کے شاگرد تھے، غالب کے اُردو خطوط کا مجموعہ چھاپنے کا ارادہ کیا تو غالب کے لیے یہ قطعی نئی اور زائد بات تھی۔ انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں شیو نرائن کو لکھا کہ:

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔"[1] [محررہ: ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء]

اردو خطوں کی اس اشاعت کی تجویز میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی، شیو نرائن کے شریک تھے اور بضد تھے کہ خط ضرور چھاپے جائیں۔ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ:

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"[2]

---

[1] اُردوئے معلیٰ، طبع اول، اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۹۹ء، صفحہ ۲۰۱

[2] اُردوئے معلیٰ، طبع اول، ایضاً، صفحہ ۱۰۵

اسی روز ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے منشی شیو نرائن کو لکھا کہ :

"رقعوں کے چھاپنے کے بارے میں ممانعت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو عمل کرنا ضرور ہے۔" [اُردوئے معلّیٰ، طبع اوّل، صفحہ ۳۶۱]

آرام اور تفتہ کی تحریک و تجویز نے، جسے ۱۸۵۸ء میں نامرغوبات کہہ کر جھٹک دیا گیا تھا ۱۸۶۲ء میں چودھری عبدالغفور سرور کے ہاتھوں عملی شکل اختیار کی اور بالآخر ۱۸۶۸ء میں یہ تجویز "عودِ ہندی" کے نام سے حقیقت بن کر اُبھری۔ [۴۵] اور اس کی خوشبو "ہند و سند" میں ہر چہار طرف پھیل گئی۔ "عودِ ہندی" بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد غالب کے اردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کے کام کا ایک تار بندھ گیا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کا یہ احساس بالکل بجا ہے کہ :

چودھری عبدالغفور خاں سرور، میرزا غالب کے مخلص نیاز مندوں میں اس اعتبار سے بطورِ خاص ممتاز ہیں کہ انھیں سب سے پہلے (جب) اردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کا خیال آیا (تو) میرزا تفتہ یا شیو نرائن آرام کی طرح (وہ) میرزا غالب سے اجازت لینے کے تکلف میں نہ پڑے، بلکہ اپنے نام کے، نیز حضرت صاحب عالم مارہروی اور حضرت شاہ عالم کے نام کے خطوط مرتب کرکے ان کا نام "مہرِ غالب" رکھا اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھ دیا۔ یہ مجموعہ صرف "عودِ ہندی" ہی کا جزو نہ بنا بلکہ حقیقتاً اسی آغاز کے نتیجے میں مکاتیب غالب کے مختلف مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ منعطف ہوئی۔

---

[۴۴] چودھری عبدالغفور سرور کے حالات میں دیکھیے کتاب :
غالب اور سرور، مؤلفہ : اے۔ جے۔ حبیب خاں، کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی، دسمبر ۱۹۷۵ء
[۴۵] عودِ ہندی، طبع اوّل : مطبع مجتبائی، میرٹھ، اکتوبر ۱۸۶۸ء

"عودِ ہندی"، "اُردوئے معلیٰ"، "مکاتیب غالب"[۵۵]، "نادراتِ غالب"[۵۶] وغیرہ "مہرِ غالب" ہی کی وجہ سے منظرِ عام پر آئے۔"[۵۷]

"عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب کے بارے میں چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے کے علاوہ، صاحبِ مطبع، محمد ممتاز علی خاں کے ابتدائی کلمات سے جو کوائف سامنے آتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ چودھری عبدالغفور سرور جو مارہرہ ضلع ایٹہ، یو۔پی کے رئیس تھے اور جن کے خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ کے سجادہ نشین، حضرت صاحبِ عالم سے گہرے روابط تھے، غالب کے نامہ ہائے اُردو کی عبارت کے گھائل تھے۔ سرور اپنے نام کے خطوط غالب سے تنہا متلذذ ہونے اور آپ ہی آپ مزہ اُٹھانے کو خلافِ انصاف جانتے ہوئے، انھیں احباب کو بھی سُنایا کرتے تھے اور غالب کے ان رقعات کے ضمن میں چودھری عبدالغفور سرور کا "دل مائل تمام بہ شہرتِ عام" تھا۔

ادھر میرٹھ کے رئیس اور مطبع مجتبائی کے مہتمم، محمد ممتاز علی خاں کو "مدت سے اس کا خیال" تھا کہ غالب کی "نثرِ اُردو، اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے، اسے بھی ترتیب" دیا جائے۔ حسنِ اتفاق کہ ممتاز علی خاں، رونق افزائے مارہرہ ہوئے، اور سرور نے انھیں اپنے آمدہ رقعاتِ غالب سُنائے، ممتاز علی خاں، غالب کی نثرِ اُردو ترتیب دیے جانے کے پہلے ہی مدت سے خواہاں تھے، اب جو انھوں نے سرور کی زبانی رقعاتِ غالب سُنے تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ "اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سُنائے ہیں، جمع کرو تو میں بیڑا اٹھاتا ہوں" ان کے چھاپنے کا — یہ پیش کش سرور کے عین حسبِ منشا تھی، انھوں نے خط ترتیب دیے، سالِ ترتیب کا قطعہ کہا، دیباچہ لکھا اور یہ مجموعہ اشاعت کے لیے ممتاز علی خاں کے سپرد کیا۔ اب

---

۵۵ مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، طبع اوّل: مطبعۂ قیمہ، بمبئی ۱۹۳۷ء

۵۶ نادراتِ غالب، مرتبہ آفاق حسین آفاق دہلوی، طبع اوّل: ادارۂ نادرات، کراچی ۱۹۴۹ء

۵۷ خطوطِ غالب، طبع اوّل، مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۹۱۵

ممتاز علی خاں صاحب کا بیان ہے کہ عرصے تک سرگرم تلاش رہے" جا بجا سے اور
تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں، بڑی محنت اٹھائی، تب تمنا بر آئی" اور یہ
مجموعہ کہ "عود ہندی" اس کا نام ہے، مرتب ہوا۔

چودھری عبدالغفور کا دیباچہ اہتمامی زبان میں ہے۔ لمبی چوڑی تمہید دگریز
اور مدح و ثنا کے بعد لکھتے ہیں کہ میں آغازِ شعور سے اہلِ سخن کا طالب اور خواہاں
تھا۔ جب غالبؔ کا کلام دیکھا، بہت متأثر ہوا۔

"ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا.....
کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاحِ شعر و عبارت میں
دریغ اور ننگ نہ فرمایا۔ جو نامہ کہ بنام میرے بہ عبارت اُردو تحریر کیا،
مکتوب سادہ رویوں سے دل رباتر، اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے
تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا وہ بینا ہے۔ جس کان نے سُنا
وہ شنوا ہے، پس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اُٹھانا خلافِ
انصاف جانا۔ دل، مائل تمام بہ شہرتِ عام ہوا اور ہنوز یہ قصد ناتمام
تھا کہ بہ حُسنِ اتفاق فخرِ زمان وحیدِ دوران جناب ممتاز علی خاں صاحب
متوطن میرٹھ..... رونق افزائے مارہرہ ہوئے . . . . ایک روز محفل ممدوح
میں ذکرِ ہمہ دانی و شیوا بیانی جناب استاذی و مخدومی درمیان آیا۔ ارشاد
کیا کہ کلام مرزا صاحب نسیم جاں فزا اور شمیم دل کُشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا
اُردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر تو محلّیٰ بہ حلیۂ انطباع ہوا، لیکن نثر اُردو زیورِ طبع
سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سُنائے ہیں،
جمع کرو تو میں بیڑا اُٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا۔
منشأ خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے مجھے ترتیب دیے،

گویا جواہر بے بہا کان قلم دان سے نکال کر کشتیٔ اوراق میں جمع کیے چونکہ محبت جناب غالبؔ میرے حال پر بہت ہے، لہٰذا نام اس انشا کا مہر غالب (بکسر میم) مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔ طبیعت اور بڑھی۔ تحریر تاریخ کو دستِ قلم بڑھایا:

انشا مملو بہ صد مطالب لکھی یعنی پئے دوستان طالب لکھی
موسوم کیا جو "مہر غالب" سے سرورؔ تاریخ بھی اس کی "مہر غالب" لکھی شد

"مہر غالب" سے ۱۲۷۸ کا عدد حاصل ہوتا ہے جو ۶۲-۱۸۶۱ سنہ عیسوی کے مطابق ہے۔ یہ اُس اور اُتنے حصۂ کتاب کا سالِ اتمام ہے جسے چودھری عبدالغفور سرورؔ نے مرتب کیا، لیکن بحیثیتِ مجموعی پوری کتاب کی ترتیب کا کام اگست ۱۸۶۶ء میں انجام پایا اور کتاب کی طباعت کہیں اکتوبر ۱۸۶۸ء میں جا کر مکمل ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ابتدا ۶۲-۱۸۶۱ء میں سرورؔ نے "مہر غالب" کے نام سے انشائے غالب مشتمل بر رقعات کا مجموعہ مرتب کر کے بغرضِ اشاعت محمد ممتاز علی خاں کے حوالے کیا۔ ممتاز علی خاں کا بیان ہے کہ:

"بندے سے خدا کی تعریف ہو کیا مجال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بندہ سراپا عصیاں محمد ممتاز علی خاں جب اپنے کو اس سے عاجز پاتا ہے تو حرفِ مطلب زبان پر لاتا ہے۔ نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ ۔ ۔ ۔ ۔ سارا ہند انھیں جانتا ہے۔ ایران تک اُن کی جادو بیانی کا چرچا ہے۔ مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں[۵۹]

---

۵۸ عودِ ہندی، طبع اول، ایضاً ۱۸۶۸ء، صفحہ د و بہ بعد

۵۹ عودِ ہندی کی اشاعت اکتوبر ۱۸۶۸ء تک غالبؔ کی یہ فارسی تصنیفات (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لوگوں نے فیض اُٹھائے ۔ تعویذ بازو بنائے مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔[ٹلہ] یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی حالانکہ نثر اردو ان کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سلاست بیان

(بقیہ حاشیہ) شائع ہو چکی تھیں:

(ا) نظم فارسی: (i) دیوان فارسی، مطبع دارالسلام، حوض قاضی، دہلی، ۱۸۴۵ء

(ii) کلیات غالب، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۳ء

(iii) مثنوی ابر گہربار، مطبع اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۴ء

(iv) قطعۂ غالب، مطبع اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۶ء

(v) سبد چین، مطبع محمدی، دہلی، ۱۸۶۶ء

(vi) مثنوی دعاء صباح، مطبع نولکشور، لکھنؤ، قبل ۱۸۶۸ء

(ب) نثر فارسی: (i) پنج آہنگ، مطبع سلطانی، دہلی، ۱۸۴۹ء، مطبع دارالسلام، دہلی، ۱۸۵۳ء

(ii) مہر نیم روز، فخر المطابع، دہلی ۱۸۵۴ء

(iii) دستنبو، مطبع مفید خلائق، آگرہ ۱۸۵۸ء، مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، بریلی، ۱۸۶۵ء

(iv) قاطع برہان، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۲ء، درفش کاویانی، اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۵ء

(v) نکات (اردو) و رقعات غالب (فارسی)، مطبع سراجی دہلی ۱۸۶۷ء

(vi) کلیات نثر غالب، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۸ء

ٹلہ یہ صحیح نہیں کہ "عود ہندی" کی اشاعت اکتوبر ۱۸۶۸ء تک غالب کا صرف اردو دیوان ہی ترتیب و طباعت کی منزل سے گزرا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دیوان کے علاوہ غالب کی اردو نظم و نثر کی یہ چیزیں چھپ چکی تھیں: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شستگیٔ زبان، روزمرہ کی صفائی اور ان کی شوخی کسی کو کب میسّر ہے۔
اسے بھی ترتیب دیجیے۔ قدر دانوں پر احسان کیجیے ..... مرزا صاحب
کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرورؔ تخلص سے یہ ذکر آیا تو
انھوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے، سب کو
ایک جا کرکے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔
عرصے تک سرگرم تلاش رہا، جا بجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی
بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اُٹھائی تب تمنّا بر آئی اور مجموعہ مرتّب ہوا۔
آج پورا اپنا مطلب ہوا۔ خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ تخلص جو نواب
معلی القاب لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میرمنشی اور
میرے مخدوم خاص، اور حضرت غالب صاحب کے مخلصِ باختصاص ہیں،
اس تلاش میں میرے معین و مددگار رہے بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت
بہم پہنچا ہے۔[۱]

(بقیہ حاشیہ)

(الف) نظمِ اُردو : قادر نامۂ غالب (i) طبع اول : مطبع سلطانی، دہلی، ۱۸۵۶ء

(ii) طبع دوم : مطبع العلوم، دہلی، ۱۸۶۱ء

(iii) طبع سوم : مجیس پریس، دہلی ۱۸۶۲ء

(ب) نثرِ اُردو : (i) لطائف غیبی، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۴ء

(ii) سوالاتِ عبدالکریم، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۴ء

(iii) نامۂ غالب، مطبع محمدی، دہلی، ۱۸۶۵ء

(iv) تیغِ تیز، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۷ء

[۱] عودِ ہندی، طبع اول، ۱۸۶۸ء، صفحہ ۲، ۳

گویا سرور نے "مہر غالب" کے نام سے جو خط جمع کیے تھے منشی محمد ممتاز علی خاں نے انھیں کافی نہ سمجھتے ہوئے مزید رقعات کی فراہمی کو ضروری خیال کیا، عرصے تک سرگرم تلاش رہے، جا بجا سے کوشش کر کے اور تحریریں مرزا غالب کی بہم پہنچائیں، تب ان کی تمنا بر آئی اور یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ فراہمیٔ مکاتیب کی اس مہم میں محمد ممتاز علی خاں نے منشی غلام غوث بے خبر کو اپنا معین و مددگار" بتاتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ "بہت ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا" لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خاتمے میں چند نثریں ہیں جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔"[۱۲]

۱۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ۔

۲۔ دوسری فصل میں میرے (محمد ممتاز علی خاں کے) جمع کیے ہوئے رقعات۔

۳۔ خاتمے میں چند نثریں جو غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائیں۔

یہاں منشی غلام غوث بے خبر درمیان سے بالکل نکل ہی گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعے کی ترتیب و تدوین میں بے خبر کے انہماک اور ان کی محنت اور مساعی کو سب سے زیادہ دخل رہا ہے، لیکن کتاب چونکہ ممتاز علی خاں اور چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے کے ساتھ چھپی، اسی لیے مرتب اصلی یعنی بے خبر پس منظر میں چلے گئے اور ممتاز علی خاں کے بیان میں صرف ضمناً ان کی معاونت کا ذکر آ گیا

---

[۱۲] عود ہندی، ایضاً، صفحہ ۲

جبکہ اصلاً یہ ذخیرہ بہت کچھ بے خبر ہی کی بدولت بہم پہنچا۔

سرور نے منشی ممتاز علی خاں کی فرمائش پر رقعاتِ غالب جمع کیے اور اس پر دیباچہ لکھا۔ یہ مجموعہ اور دیباچہ خواجہ غلام غوث بے خبر کے پاس آیا اور مزید خطوط کی فراہمی اور ترتیب کے سلسلے میں کئی سال ان کی تحویل میں رہا۔ "فغانِ بے خبر" اور "انشائے بے خبر" کے نام سے خواجہ غلام غوث بے خبر کے خطوں اور تقریظوں وغیرہ کے دو مجموعوں میں غالب اور بعض دیگر اصحاب کے نام بے خبر کے خطوط، اس امر پر شاہد ہیں کہ حقیقتاً "عودِ ہندی" کی ترتیب کا کام صحیح معنی میں انھی نے انجام دیا اور اس کارِ ضروری میں انھیں غالب کی تائیدًا استمداد اور مشورت و رہنمائی بھی حاصل رہی۔ "انشائے بے خبر" میں غالب کے نام ایک خط سے "عود ہندی" کی ترتیب و تدوین اور اس میں بے خبر کے دخل اور دلچسپی پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"حضرت، نسخہ "عود ہندی" کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آگیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں[۳۲]، خود سب کو دیکھا، جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے، ان کو نکال ڈالا۔ کاتب لکھ رہا ہے، میں مقابلہ کرتا ہوں

---

[۳۲] پنڈت مہیش پرشاد لکھتے ہیں:۔

"اس بنا پر یہ ضرور ہے کہ موسومہ ذیل حضرات کے نام کے خطوط خواجہ صاحب نے خود جمع کیے (البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کی فراہمی میں منشی محمد ممتاز علی صاحب سے دکچھ) مدد ملی ہو:

انورالدولہ شفق (کالپی)، مہر (آگرہ)، عبدالرزاق مچھلی شہری، اس زمانے میں گورکھپور میں مقیم تھے، جنوں (بریلی)، مفتی عباس (لکھنؤ)، مولوی عزیز الدین، رعنا، شیفتہ وغیرہ۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ ادھر (اگست) کا آغاز ہو، ادھر اس مجموعے کا انجام ہو۔ میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لیے ان کے حوالے کروں۔ اس وقت بھی مقابلے میں مصروف ہوں، پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکا، میاں داد صاحب سیاح، ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے۔ آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو، بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رامپور تو میں نے خود لکھا ہے، شاید وہاں سے بھی کچھ آجائے۔ جب تک کتاب تمام ہو، اور جس قدر خطوط ہاتھ

(بقیہ حاشیہ)

خواجہ صاحب چونکہ اس صوبے کے اعلیٰ حاکم کے میر منشی تھے اور ادیب بھی تھے، لہٰذا اس صوبے سے تعلق رکھنے والی تحریروں کو وہ بآسانی اِک جا کر سکے۔ باقی جس طرح مولوی عبدالغفور نساخ کے نام کے خط کا مسودہ خواجہ بے خبر صاحب کے پاس غالب نے خود بھیجا تھا، اسی طرح ممکن ہے کہ ان حضرات کے خطوط کی نقلیں بھی مرزا غالب ہی نے خواجہ بے خبر صاحب کو بھیجی ہوں، جیسا کہ خود لکھتے ہیں کہ مرزا غالب سے "بہت کچھ حاصل کیا: تا مجروح، سرفراز حسین، ملاّئی، تفتہ، مرزا یوسف علی عزیز اور ظہیر الدین کی طرف سے خط":

ہندستان، ہندوستانی، الٰہ آباد، اکتوبر ۱۹۲۵ء، صفحہ ۲۹۷-۲۹۸

میرزا رحیم بیگ میرٹھی کے نام طویل خط پہلے ہی الگ رسالے کی صورت میں چھپ چکا تھا (نامۂ غالب، مطبع محمدی، دہلی ۱۸۶۵ء) بے خبر کو آسانی سے مل گیا ہوگا۔ نساخ کے نام کا خط خود غالب نے بے خبر کو بھیجا۔ انورالدولہ کے نام کا کم از کم ایک خط تو یقیناً غالب کے ایما، پر غالب کو ملا اور خود بے خبر کے نام کے ۵ خط بھی بے خبر کے ہاتھوں شامل کتاب ہوئے۔ غرض یہ کہ "عود ہندی" کی ترتیب اور فراہمی مکاتیب میں بے خبر شریک غالب معلوم ہوتے ہیں۔

آویں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔"[۱۳۵]

اتفاق سے اس خط کا جواب بھی محفوظ ہے، غالب لکھتے ہیں:

"آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں (شیفتہ) حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشار اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب (شیفتہ و حسرتی) کو یوں لکھا جاتا ہے:

"کہار یا ڈاک خط لایا، آم پہنچے، کچھ بانٹے، کچھ کھائے، بچوں کو دُعا، بچوں کی بندگی، مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام۔"

یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے، غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت، جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائق شمول مجموعۂ نثر اردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔"[۱۳۶]

مولانا غلام رسول کے بقول:

"غالب کا یہ بیان صحیح نہیں، اغلب ہے کہ میرزا غالب کو یاد نہ رہا ہو۔ حبیب اللہ ذکا کے نام کم و بیش پندرہ خط مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں۔ ان کی ابتدا جولائی ۱۸۶۲ء سے ہوئی اور یہ سلسلہ جنوری ۱۸۶۸ء تک برابر جاری رہا۔ نواب صاحب مصطفیٰ خاں کے نام بھی کم از کم ایک خط مجموعے میں موجود ہے۔ اغلب ہے کہ میرزا غالب کا خیال یہ ہو کہ نواب صاحب کو عموماً ایسے خط اردو میں نہیں لکھے گئے جو مجموعے میں شامل

---

[۱۳۵] انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱

[۱۳۶] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۳۹۱ و مابعد

ہونے کے لائق ہوں۔ ان میں سے ایک خط کی عبارت بھی مثالاً درج کر دی۔

مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کو غالباً کوئی تازہ خط اس مضمون کا بھیجا گیا تھا۔[۱۵]

خواجہ غلام غوث بے خبر کے مذکورہ خط اور غالب کے جواب خط سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ غالب کے خطوں میں سے ایسے مضامین کو نکال دیا گیا، جنہیں بے خبر نے اعلان کے لائق نہیں سمجھا۔

۲۔ غالب نے بے تکلف دوستانہ خطوط کو جنہیں وہ بہ عبارت "عامیانہ" بتاتے ہیں۔ مجموعے میں درج کرنے سے منع کر دیا تھا۔ گویا صرف ایسے خطوں کے شمول کی اجازت تھی جو علمی و فنی مباحث پر مبنی ہوں یا جن میں بطریق انشا پردازی، عبارت آرائی کی گئی ہو۔

لیکن "عود ہندی" کے نام سے جو مجموعہ سامنے آیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس دوسری بات کا سختی سے لحاظ نہیں رکھا گیا اور بے تکلف دوستانہ خطوط کو بھی جنہیں دراصل خطوطِ غالب کی جان سمجھنا چاہیئے، اس مجموعے میں کسی قدر جگہ مل گئی ہے۔ غالب نے بے خبر کے نام اپنے مذکورہ بالا خط کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ:

"جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا، باوجود عدم تعارف، خط مجھ کو آیا۔۔۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی، مجموعۂ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا، مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد[۱۶] میں وہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع، وہاں سے منگوا کر

---

[۱۵] خطوط غالب، طبع اول: مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ا، صفحہ ۲۹۱ و بہ بعد

[۱۶] بے خبر کا قیام الہ آباد میں تھا۔ غالباً اس بنا پر غالب کو یہ خیال ہوا کہ مجموعہ وہیں چھپ رہا ہوگا۔

بھیج دوں گا۔"[۱۸]

اس کے جواب میں بے خبر نے غالب کو لکھا کہ :

"منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے کل لکھا کہ آپ ایک عرضی جناب کمسن صاحب بہادر افسر مدارس کے حضور میں بھیج دیں اور اس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعہ نثر کا ذکر لکھا ہے، اُسے میں مرتب کرتا ہوں، عنقریب چھپنا شروع ہوگا۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لیے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے۔ اس سے بہتر اور کوئی طریقہ، صاحب تک اس ذکر پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا۔"[۱۹]

اسی خط میں بے خبر نے غالب کو مطلع کیا اور اُن سے پوچھا کہ :

"جا بجا سے جو آپ کے خطوط جمع کیے گئے، وہ اصل تو کہیں سے آئے نہیں، نقلیں آئیں۔ سرور کے نام کے ایک خط میں جلال اسیر کا ایک مصرعہ لکھا ہے، وہ اسی قدر پڑھا جاتا ہے: "زغیر در شکر آب است" مارہرے والوں کے خط کا حال تو آپ پر خوب ہویدا ہے دوسرے لفظ "پنشن" کو کہیں مذکر لکھا ہے اور کہیں مؤنث، آپ تو اسے مخنث کیوں بناتے، مگر یہ خرابی بھی کاتب سے ہوئی ہے۔ ان دونوں کی تصحیح لکھیے تو کتاب میں صحیح لکھ دیا جائے۔"[۲۰]

ایک دوسرے خط میں بے خبر نے غالب کو لکھا کہ :

"یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا محمد خاں صاحب سے اپنی اُردو نثر

---

[۱۸] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ا، صفحہ ۲۹۳

[۱۹] فغانِ بے خبر، صفحہ ۸۱۔

[۲۰] فغانِ بے خبر، صفحہ ۸۲

لے کر مجھے بھیجیے گا،" اس کا کچھ جواب ہی ارشاد نہ ہوا۔"[۲۱]

"عودِ ہندی" طبع اوّل میں تفتہ کے نام غالب کا ایک خط شامل ہے (صفحہ ۹۹۔۱۰۰)

غالب کے ایک خط بنام بے خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ بے خبر نے غالب سے تفتہ کے نام کے خط فراہم کرنے کی تحریک بھی کی تھی۔ غالب جواباً لکھتے ہیں کہ :

"حضرت پیر و مرشد! اس سے آگے آپ کو.... لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار اُن کے آئے، اصلاح دے دی۔ منشار اصلاح جابجا حاشیہ پر لکھ دیا۔ کل جو عنایت نامہ آیا، اس میں بھی.... تفتہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا۔ ناچار تحریر سابق کا اعادہ کرکے حکم بجا لایا۔"[۲۲]

غالب کا یہ جواب تو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں کہ تفتہ کو انھوں نے خط لکھے ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے محفوظ اردو خطوط، سب سے زیادہ تفتہ ہی کے نام ہیں۔ یہ تعداد میں سوا سو کے لگ بھگ ہیں اور ابھی جیسا کہ مولانا غلام رسول مہر نے بھی لکھا ہے[۲۳] یقین ہے کہ خاصے خط تلف بھی ہو گئے۔ مثلاً تفتہ کے نام دستیاب خطوں میں زمانی اعتبار سے جو پہلا خط ہے، اُس کی عبارت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ پہلا خط نہیں بلکہ اس سے بیشتر کے خطوط بھی ہونے چاہئیں جو نہیں مل سکے۔ پھر ۱۸۴۸ء، ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء کا صرف ایک ایک خط ہے۔ یہ امر قرینِ قیاس نہیں کہ گہرے تعلقات کے باوصف ان برسوں میں صرف ایک ایک خط لکھا گیا ہو۔ مزید برآں غالب کے دستیاب خطوں میں تفتہ کے نام ۱۸۶۵ء کے بعد کا کوئی خط نہیں، حالانکہ تفتہ کے روابط، کوئی وجہ نہیں کہ غالب سے آخر وقت تک استوار نہ رہے ہوں۔

---

[۲۱] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۰۰

[۲۲] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ا، صفحہ ۴۶۹

[۲۳] خطوط غالب، طبع اوّل، ایضاً، ۱۹۶۹ء، جلد ا صفحہ ۲

میرا خیال ہے کہ غالب نے اگر واقعتاً تفتہ ہی کے بارے میں لکھا ہے تو اس میں یہ مصلحت کارفرما رہی ہوگی کہ تفتہ کے نام کے خطوں کی فراہمی کی فکر میں کتاب پڑی ہی نہ رہے، جلدی سے چھپ کر ایک طرف ہو بصورتِ دیگر یہ غالب کا سہوِ قلم ہے یا اس میں کاتب کی کرشمہ سازی کو دخل ہے۔ غالب کے خط کا جملہ یہ ہے:

"اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار، اُن کے آئے اصلاح دے دی، منشار اصلاح جا بجا حاشیے پر لکھ دیا۔"[۲۴]

بے خبر کے نام "اس سے آگے" کے کسی خط میں تفتہ کا ذکر نہیں آیا۔ ذکا کے بارے میں غالب نے ضرور بے خبر کو یہ لکھا تھا کہ:

"ذکا۔۔۔۔ کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا۔۔۔۔ غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت منشار اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔"[۲۵]

غالباً زیرِ بحث خط میں بھی ذکا ہی لکھنا چاہا ہوگا، تفتہ لکھا گیا یا کاتب کو سہو ہوا اور وہ "ذکا" کی جگہ "تفتہ" لکھ گیا یا اُس نے "ذکا" کو پڑھا ہی "تفتہ" اور تفتہ لکھ دیا۔

بہر نوع یہ تمام شواہد اس امر پر مظہر ہیں کہ بے خبر کو "عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب میں کس درجہ انہماک اور دخل تھا۔ جزئیات تک پر اُن کی نظر رہی اور اس بارے میں خود غالب سے نہ صرف اُن کا رابطہ رہا بلکہ انھیں برابر غالب کی تائید و اعانت بھی حاصل رہی۔ غالب نے اپنی بعض تحریریں مجموعے میں شمولیت کی غرض سے خود بے خبر کو بھیجیں۔ ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں۔ مولوی عبدالغفور

۲۴؎ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۹

۲۵؎ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۹۱

اُن کا نام اور نساخ اُن کا تخلص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ" دفترِ بے مثال" مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خط میں نے اُن کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثرِ اُردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں"۔[۴۹]

نساخ کے نام غالب کا یہ مرصع اور پرتکلف خط" عود ہندی" طبع اوّل میں موجود ہے (صفحہ ۱۲۵-۱۲۶)۔ اس خط کی ایک اہمیت یہ ہے کہ باعتبارِ مضمون اور باعتبارِ انشا و عبارت، اس خط کا تجزیہ کرکے، غالب کے اُس تصوّر کا تعین کیا جاسکتا ہے جو وہ اپنے لائقِ اشاعت رقعات کے بارے میں رکھتے تھے۔ اسی طرح ایک اور خط میں بے خبر کو لکھتے ہیں:

" میرے ایک رشتے دار کے بھتیجے نے" بوستانِ خیال" کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اس کا بصورت پارسل بلکہ بہ ہیئت خط بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے، سو نقل کرلیجیے"۔[۵۰]

یعنی اشارہ ہے کہ اس کا دیباچہ، میرے اُس مجموعۂ نثر کے لیے نقل کرلیجیے جو آپ ترتیب دے رہے ہیں۔" بوستانِ خیال" کی پہلی جلد کا یہ اُردو ترجمہ" حدائق انظار" کے نام سے خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان دہلوی نے کیا تھا۔ اس کا دیباچہ مرقومۂ غالب" عود ہندی" طبع اوّل کے خاتمے (صفحہ ۱۸۲-۱۸۴) میں موجود ہے۔

۱۵، فروری ۱۸۶۴ء کے ایک خط موسومہ انورالدولہ شفق کو غالب نے اس" گزارش" پر ختم کیا ہے:

۴۹۔ خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۰

۵۰۔ خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۷

"اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم مولوی غلام غوث خاں بہادر، میر منشی لفٹننٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجیے گا تو اُن کو خوش اور مجھ کو ممنون کیجیے گا۔"[۲۸]

مطلب یہ ہے کہ میرے اس خط کی نقل، اُس مجموعۂ نثر کے لیے بھیج دی جائے، جس کی ترتیب کا کام منشی غلام غوث بے خبر کے پیشِ نظر ہے۔

مختصر یہ کہ "غود ہندی" کی ترتیب میں بے خبر کی مساعیِ جمیلہ اور انہماکِ جلیلہ کو بے حد دخل تھا اور دربارۂ خاص انھیں غالب کی تائید بھی حاصل تھی۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام غالب کے ایک سے زیادہ خطوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بے خبر نے باصرار و تکرار خواہش ظاہر کی تھی کہ غالب اپنے اس مجموعۂ نثر پر خود دیباچہ لکھیں لیکن غالب، عذرِ علالت کی بنا پر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ایک خط میں غالب انھیں لکھتے ہیں:

"حضرت پیر و مرشد، اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحبِ فراش ہوں۔ اٹھنا، بیٹھنا ناممکن ہے۔۔۔۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں؟ کل جو عنایت نامہ آیا، اُس میں بھی دیباچے کا اشارہ۔۔۔۔ مندرج پایا۔ ناچار تحریرِ سابق کا اعادہ کر کے حکم بجا لایا۔"[۲۹]

یعنی عذرِ سابق کا اعادہ کر کے تعمیلِ ارشاد سے معذرت چاہ لی۔ بے خبر نے غالباً پھر دیباچے کے لیے کہا کہ بے دیباچہ کتاب کیوں کر چھپے گی؟ غالب جواباً لکھتے ہیں کہ:

"بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو،

---

[۲۸] خطوط غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۴۹

[۲۹] خطوط غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۹

بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اس مجموعے کا چھپ جانا 'بالفتح' میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا 'بالضم' چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکانِ تحریر میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟"[۵۳]

حاصل یہ کہ غالب اپنے مجموعے پر آپ دیباچہ لکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔

بے خبر نے "عود ہندی" کی جمع و ترتیب میں بہت وقت صرف کیا۔ خطوط کی فراہمی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ غالب نے بھی اعانت اور استمداد کی۔ بایں ہمہ اس کوشش و کاوش کے باوجود بمشکل پونے دو سو کے قریب خط جمع کیے جا سکے یا کہیے کہ لائقِ اشاعت اتنے ہی سمجھے گئے۔ بے خبر نے ان کی جلد بندھوائی اور اشاعت کی غرض سے مولوی ممتاز علی خاں کو بھیج دی۔ "انشائے بے خبر" کا ایک خط، اس ضمن میں اہم ہے۔ 'بے خبر' غالب کو لکھتے ہیں:

"غالی جناب، میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے۔ اس میں یہ مطلب، جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے، اُس کا نام کیا ہے؟ اور وہ کہاں چھپا ہے؟ آج تک جواب نہیں، کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو، جب ترکِ جواب حضرت کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجیے، مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجیے۔ الحمد للہ کہ "عود ہندی" کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بندھوا کر آج منشی

۵۳؎ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۲۸۱

ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کردی۔ اب چھپوانے میں
دیر کریں یا جلدی، اکفیں اختیار ہے۔" [۳۱]

اس خط پر بے خبر کے دوسرے خطوں کی طرح کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن بعض داخلی قرائن سے یہ ۱۸۶۶ء کا قرار پاتا ہے۔ مولوی صاحب جہانگیر نگری کے جس رسالے کا بے خبر کے اس خط میں ذکر ہے، اُس کا نام "موید برہان" ہے اور یہ رسالہ ۱۸۶۶ء میں مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری نے غالب کی "قاطع برہان" کے رد میں لکھا تھا اور کلکتے سے ٹائپ میں بہت اہتمام سے چھپا تھا۔ ایک دوست نے کلکتے سے غالب کو اس کی اطلاع دی۔ غالب نے محض اس اطلاع پر "موید برہان" کو دیکھے بغیر اکتیس (۳۱) اشعار کا ایک فارسی قطعہ لکھا اور چھپوا کر نزدیک و دور احباب کو بھیج دیا۔ یہ ایک قطعہ ایک ورق پر اکمل المطابع، دہلی میں چھپا۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے گویا یہ اس سے کچھ پہلے اور ذکا کے نام پچھلے موجود خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء کے بعد چھپا تھا۔ اس قطعہ کا مطبوعہ عنوان یہ ہے:

"قطعہ در گذارش سپاس یاد آوری بعالی خدمت جناب مولوی
آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری"۔ [۳۲]

اور اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ
در خصوص گفتگوی پارس انشا کردہ است

اس قطعہ میں مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کے نسخے "موید برہان" کا نام کہیں

---

۳۱ انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱ و بہ بعد

۳۲ دیکھیے، حبیب اللہ ذکا کے نام ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کا خط مشمولہ اردوئے معلیٰ، دہلی ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۴

نہیں آیا۔ یقیناً یہی مطبوعہ[۲۳] قطعہ، غالب نے بے خبر کو بھیجا ہوگا۔ اور ق۔ رتی طور پر انھیں مولوی صاحب جہانگیر نگری کے رسالے کا نام جاننے کا تجسس ہوا اور انھوں نے غالب سے پوچھا کہ اس رسالے کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے؟

اس خط کا زمانۂ کتابت ۱۲ مئی سے ۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کے مابین طے پاتا ہے۔ اس میں انھوں نے "عودِ ہندی" کے ترتیب پا جانے اور اشاعت کے لیے اُسے صاحب مطبع ممتاز علی خاں کے حوالے کر دینے کی اطلاع دی ہے لیکن ایک اور ذریعے سے "عودِ ہندی" کے مسودے کا صاحبِ مطبع کے سپرد کیے جانے کا زمانہ ۱۲ مئی سے ۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کے مقابلے میں اور زیادہ متعین طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

"چودھری عبدالغفور صاحب (کی خدمت میں) سلام پہنچائیں
اور یہ بھی کہہ دیں کہ مولوی غلام غوث خاں، میر منشی نے آپ کا دیا،
اور میرا مجموعۂ نثر مرتب کر کے منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا ہے،
اب چھپوانے میں ان کو اختیار ہے۔"[۲۴]

یہ خط ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ گویا "عودِ ہندی" کا مسودہ اس تاریخ سے پہلے اشاعت کے لیے مطبع میں بھیجا گیا۔ مسودہ ایک ذریعے سے منشی ممتاز علی خاں کو بھجواتے ہوئے بے خبر نے انھیں جو خط لکھا، حسنِ اتفاق سے وہ بھی محفوظ ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

۲۳۔ اس "قطعۂ غالب" کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مشمولہ "جشن نامہ یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور" مشتمل بر مقالات جشن صد سالۂ تاسیس، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، دسمبر ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۱۹-۴۲۶

۲۴۔ خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، جلد ۲، صفحہ ۵۸۰

"مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کر کے آج .... (؟)
صاحب کے حوالے کیا ہے (کہ) غازی الدین حسین خاں صاحب کے
پاس بھیج دیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ مصنف آپ
کے بہت قریب ہیں۔ ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجیے، تب چھپوانا شروع
کیجیے تو بہتر ہے۔ فقیر نے اس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذاتِ خود
مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردّد اور کیا کہ جو رقعات،
بریلی سے آئے ہوئے تھے (آپ نے کھو دیے) لکھوا دیے، ان کو وہاں
سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے کہ گورکھپور، لکھنؤ، کانپور سے کچھ
بہم پہنچایا اور نئی نثریں مصنف سے اور لیں اور ان سب کو بھی مجموعے
میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا، مصنف سے اس کی تصحیح کر لی۔
اب اگر یہ مجموعہ طاقِ نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف
پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے۔ جب دیکھے گا کہ آپ
نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوا لے گا اور جو جو نقل
کے طالب ہوں گے، ان کو دے دے گا۔"[۲۵]

لیکن اس تقریر و تنبیہہ کے باوجود، ممتاز علی خاں نے اس مجموعے کو طاقِ نسیاں
پر ڈالے رکھا اور اگست ۱۸۶۶ء کے بعد یہ کتاب جو دو سو صفحات کی بھی نہیں تھی،
دو برس دو ماہ تک تعویق میں پڑی رہ کر بالآخر ۲۷، اکتوبر ۱۸۶۸ء کو غالب کے انتقال
سے قریب پونے چار ماہ پہلے شائع ہوئی۔ پھر دیر آید درست آید والی بات بھی نہ
ہوئی، یعنی کتاب کی طباعت میں دیر لگی اور یہ درست بھی نہیں چھپی۔ مطبوعہ نسخہ
بے خبر کو ملا تو تأثر یہ تھا کہ مرزا غالب کے رقعات کا یہ مجموعہ "عودِ ہندی":

۲۵۔ انشائے بے خبر، صفحہ ۴۵

"افسوس ہے کہ نہایت غلط چھپا، بہت جگہ غلطی سے مطلب
خبط ہے"۔ [۲۵۶]

"عودِ ہندی" کا یہ پہلا ایڈیشن ½9 x ۶ انچ پر ۱۹ سطری مسطر کی بڑی تقطیع
کے ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کی جدول پھولدار ہے اور سفیدہ میں صفحے کے
وسط میں پھولوں کے درمیان خوش خط جلی قلم سے "عودِ ہندی" لکھا ہوا ہے۔ سرورق
کا ڈیزائن مجموعی طور پر "دیوانِ غالب" نظامی ایڈیشن، کانپور (۱۸۶۲ء) سے بہت
حد تک مماثل اور مشابہ ہے۔ سرورق پر ایک جلی شعر کے بعد یہ عبارت ثبت ہے:
بفضل واہب العطیات خالق الخیر والحسنات انشاء اُردو لاجواب موسومہ بہ

عودِ ہندی

من تصنیف جناب استادِ زمان علّامہ عصر اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب
حسب فرمائش مجمع خوبی جہاں میاں محمد ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ
در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید *

سرورق کی پشت یعنی صفحہ ۲ سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے زیرِ عنوان صاحب مطبع
محمد ممتاز علی خاں کے "حرفِ مطلب" ہیں۔ یہ صفحہ ۳ تک گئے ہیں۔ اسی صفحے کے بقیہ
حصّے سے چودھری عبدالغفور سرور کا لکھا ہوا دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ سرور کا دیباچہ
مرصّع اور مقفیٰ عبارت میں ہے۔ اسے غالب نے طباعت سے قبل دیکھا تھا اور ایک
مقام پر جزواً عبارت کی اصلاح کی تھی، لیکن بحیثیتِ مجموعی سرور کو اس نگارش پہ
ان لفظوں میں داد دی تھی:

---

۲۵۶ بنام: مولوی عبدالقیوم۔ فغانِ بے خبر: صفحہ ۱۴۱

* "عودِ ہندی" کا پہلا ایڈیشن غالباً دو طرح کے سرورق کے ساتھ چھپا یا پھر "عودِ ہندی" کا کوئی
ایڈیشن، مطبع مجتبائی، میرٹھ ہی سے بمقابلہ طبع اول، سرورق کے فرق کے ساتھ بھی شائع
ہوا۔ یہ ایڈیشن قومی عجائب گھر، کراچی میں محفوظ بتایا گیا ہے۔ (بحوالہ عکس سرورق مطبوعہ
ماہِ نو، کراچی فروری ۱۹۶۲ء، مابین صفحہ ۱۲ و ۱۳)

عودِ ہندی

در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

(لوحِ "عودِ ہندی" طبع اوّل، میرٹھ: اکتوبر ۱۸۶۸ء)

"آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے، کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی۔"[۲۷]

سرور کا دیباچہ صفحہ ۶ پر ختم ہوا ہے۔ اسی صفحے سے غالب کے رقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ کتاب کی دو فصلیں اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری عبدالغفور سرور کے مرتب کیے ہوئے خط ہیں اور دوسری فصل کے خط منشی محمد ممتاز علی خاں اور خواجہ غلام غوث بے خبر کی جمع و ترتیب کا نتیجہ ہیں۔ خاتمے میں غالب کی ایسی چند تحریریں ہیں جو انھوں نے دوسروں کی کتابوں پر تقریظ یا دیباچے کے بطور قلم بند کیں۔

"پہلی فصل" صفحہ ۶ کے قریب وسط سے شروع ہو کر صفحہ ۴۷ کی پہلی سطر ختم ہوتی ہے، اس میں بظاہر کل ۴۲ خط ہیں (۲۶ سرور کے نام، ۱۴ صاحب عالم مارہروی کے نام، اور دو شاہ عالم مارہروی کے نام) لیکن حقیقتاً یہ تعداد میں ۴۲ کے بجائے ۴۱ ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ کہ سرور اور صاحب عالم دونوں کا تعلق مارہرہ سے تھا۔ سرور، صاحب عالم کے معتقدوں میں بمنزلہ عزیزوں کے تھے۔ غالب نے اکثر سرور کے نام کے خط آخر میں روئے سخن صاحب عالم کی طرف کر کے پورے کے پورے خط اُن کے نام بھی لکھ ڈالے ہیں (دیکھیے خط نمبر ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۱۸، ۲۰، ۲۵، ۲۸)۔ اس طرح غالب کے نو خط جو دراصل صاحب عالم مارہروی کے نام ہیں، چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے خطوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ سرور کے نام ایک خط نمبر ۲ میں غالب نے شیفتہ کے نام اپنے ایک پرانے مطبوعہ فارسی خط کو بھی نقل کیا ہے۔[۲۸] اسے بھی الگ شمار کیا جانا چاہیے۔

---

[۲۷] خطوط غالب، مولانا غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۵۰۵

[۲۸] یہ فارسی خط "پنج آہنگ" میں شامل ہے۔ دیکھیے: طبع دوم، مطبع دارالسلام دہلی، ۱۸۵۳ء، صفحہ ۲۹۱

صرف ایک خط جو شیفتہ کے نام ہے (صفحہ ۱۱، ۱۲) فارسی میں ہے، باقی چالیس اُردو میں ہیں۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ۲۶، صاحب عالم کے نام ۱۲، اور شاہ عالم کے نام ۲۔ ان میں سے کسی ایک مکتوب الیہ کے سب خط ایک ہی جگہ نہیں ہیں، خط نمبر ۷، ۱۷ اور ۲۳ صاحب عالم کے نام ہیں۔ خط نمبر ۱۱ اور ۱۵ شاہ عالم کے نام اور خط ۱ تا ۶، ۸ تا ۱۰، ۱۲ تا ۱۴، ۱۶، ۱۸ تا ۲۲، اور ۲۴ تا ۳۱ سرور کے نام ہیں۔

یہ سب کے سب خط ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۲۷۸ھ [۱۸۶۱-۶۲ء] کی درمیانی مدت کے ہیں، لیکن انھیں جمع کرنے میں تاریخ نگارش کی ترتیب بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی، گو بجائے خود ایسا بھی نہیں کہ خطوں کی تاریخوں کے اندراج کا لازماً اہتمام کیا گیا ہو۔ یہ عدم احتیاط اور بے ترتیبی کتاب کی صرف "پہلی فصل" ہی سے خاص نہیں ہے، تا آخر صورتِ حال اس سے مختلف نہیں۔ دراصل ان خطوں کی ترتیب کا محرک اوّل، صرف اور صرف زبان کا چٹخارہ یا ادبی نکات سے استفادہ تھا اور اس کے لیے ترتیب و تدوین کے وہ سارے اہتمام، جنھیں آج تحقیق و تدوین کے مبادیات میں خیال کیا جاتا ہے، اُس وقت پیشِ نظر نہیں رکھے گئے یا غیر ضروری سمجھے گئے۔

"عودِ ہندی" کی "دوسری فصل" ۱۳۵ رقعاتِ غالب پر مشتمل ہے۔ اس میں مجروح کے نام سب سے زیادہ خط ہیں۔ یہ تعداد میں ۲۱ ہیں۔ اس کے بعد بے خبر کے نام ۲۵، شفق کے نام ۲۰، مہر کے نام ۱۸، جنوں کے نام ۱۷، شاکر کے نام ۱۰، مرزا یوسف علی عزیز اور مردان علی خاں رعنا کے نام دو دو، اور علائی، سرفراز حسین، تفتہ، نساخ، شیفتہ، مولوی عزیزالدین اور مفتی عباس کے نام ایک ایک خط۔ "نامۂ غالب" (مطبوعہ ۱۸۶۵ء) بنام میرزا رحیم بیگ میرٹھی بھی "عودِ ہندی" میں

شامل ہے (صفحہ ۱۴۱ - ۱۵۵)۔ حکیم غلام نجف خاں کے بیٹے ظہیر الدین کی جانب سے (غالب کا مکتوبہ)، اُن کے چچا کے نام ایک خط بھی "عود ہندی" (صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷) میں شریکِ اشاعت ہے۔

"خاتمہ" تقریظاتِ غالب پر مبنی ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تقریظ بر مثنوی مہر	صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰
۲۔ تقریظ بر "گلزارِ سرور"	۱۸۰ - ۱۸۲
۳۔ دیباچہ "حدائق انظار"	۱۸۲ - ۱۸۴
۴۔ "قواعد تذکیر و تانیث" کا دیباچہ	۱۸۴ - ۱۸۵
۵۔ دیباچہ مجموعۂ قصائد نادر	۱۸۵

ان پانچ تقریظات کے بعد، پھر غالب کا ایک خط ہے (صفحہ ۱۸۵ - ۱۸۶) یہ منشی غلام بسم اللہ کے نام ہے۔ بظاہر یہ رقعہ اولاً کتابت سے رہ گیا یا اس وقت جامعین کے ہاتھ آیا ہوگا جب کتاب کی "دوسری فصل" جو رقعات پر مبنی تھی، چھپ چکی ہوگی، اس لیے اس تنہا رقعے کو "خاتمہ" کی تقریظات کے بعد لگا دیا گیا۔

صفحہ ۱۸۶ ہی سے "عود ہندی" کی پُر تکلف مسجع اُردو نثر میں تقریظ ہے جو بعد انطباع کتاب "عود ہندی" کے طابع محمد ممتاز علی خاں کی فرمائش پر بطور "عبارت خاتمہ" حکیم غلام مولا قلق میرٹھی نے لکھی ہے اور کتاب کے صفحہ آخر ۱۸۸ تک چلی ہے اس آخری صفحے پر تقریظ قلق کے بعد قلق کا قطعۂ تاریخ انطباع ہے:

مطبوع طبع بے شک، بے شک ہے "عود ہندی"
کیا طرفہ گفتگو ہے، اُردو کا باغ ہے یہ
خود سالِ طبع دل سے کہتا ہے اے قلق لکھ
کیا سہل مادہ ہے: "راحِ دماغ ہے یہ"

۱۲۸۵ھ

اس کے بعد منشی عبدالحکیم احمد محو، شاگرد قلق، رئیس میرٹھ کا قطعۂ تاریخ ہے:

جب چھپی "عود ہندی" غالب — دیکھ کر میں بھی باغ باغ ہوا
سوئے تاریخ آگیا جو خیال — کرتے ہی فکر انفراغ ہوا
یہ تہہ دل سے شور اٹھا اے محو — لکھ بھی دے "طیب ہر دماغ ہوا"

۱۲۸۵ھ

آخری شعر کے مصرعۂ اولیٰ کے پہلو میں "در مطبع مجتبائی محمد ممتاز علی خاں" درج ہے اور دوسرے مصرعے کے پہلو میں "۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری طبع شد" کے لفظ رقم ہیں۔ گویا "عود ہندی" کا چھاپا ۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری، مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو غالب کی زندگی میں تمام ہوا۔

منشی عبدالحکیم احمد محو کے قطعۂ تاریخ کے بعد دو فارسی قطعے حاشیے پر لکھے گئے ہیں۔ پہلے کا عنوان ہے "قطعۂ تاریخ" اور قطعہ یہ ہے:

چوں بہ کوشش عود ہندی طبع شد
از پریشانیِ خاطر جمع شد
بے سریم از پیش کردم رقم
نسخۂ مطبوع جاں ہا طبع شد

دوسرے قطعے کے عنوان میں صرف "دیگر" لکھا گیا ہے اور اس سے کتاب کا میور صاحب کے نام انتساب ظاہر ہوتا ہے۔ "میور" سے غالباً سر ولیم میور مراد ہیں جو اس زمانے میں ممالک مغربی و شمالی کے گورنر تھے۔ اس قطعۂ تاریخ و انتساب کے لفظ یہ ہیں:

چو میور صاحب والا مناقب
ہنر را داد داد ارجمندی

برائے نذر، ممتاز علی خاں

بیاورد ایں متاعِ حُسن وخوبی

زہے ایں آورد رنگیں مضامین

کلام از طبعِ اُو دَرخود فروشی

نوشتم از سر انصاف تاریخ

بہ ہوش آمد سخن زین عود ہندی"

ان دو آخری قطعات پر کسی کا نام ثبت نہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ یہ دو قطعات:

" غالباً خود منشی ممتاز علی خاں صاحب کے ہیں۔"[۳۹]

مجھے اسے قبول کرنے میں تأمل ہے کیوں کہ مولانا امداد صابری کے بقول:

"منشی ممتاز علی خاں کو ادب وشعر سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ البتہ وہ اچھے شاعروں اور نثر نگاروں کو ضرور پسند کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کو سب سے زیادہ غالب نے متأثر کیا تھا۔ غالب کے متعدد دوستوں اور شاگردوں سے اُن کی دوستی بھی تھی۔ لیکن اُن کا اصل کام ٹھیکہ داری تھا۔ وہ سرکاری عمارتوں اور مکانوں کے ٹھیکے حاصل کرتے تھے۔"[۴۰]

اس پس منظر میں یہ قطعات، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی ممتاز علی خاں کے تو قطعاً نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خود غالب کے زائیدۂ فکر ہیں۔ "پریشانی خاطر جمع شد" اور "خود فروشی" والی بات وہ خود ہی کہہ سکتے تھے، پھر کتاب کو حکامِ عالی مقام کی نذر کرنا بھی خود غالب کا خاص شیوہ رہا ہے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اس

۳۹ مکاتیب غالب، طبع اوّل: مطبعۂ قیمہ، بمبئی، ۱۹۳۷ء، دیباچہ، صفحہ ۱۸۲

۴۰ تاریخ صحافت اردو، جلد سوم، دہلی، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۵

کتاب کی اشاعت میں تعویق سے غالب کو بہت اُلجھن تھی۔ بے خبر کے نام، مارچ ۱۸۶۴ء کے خط میں پوچھتے ہیں:

"ہاں حضرت، کہیئے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہو گی؟ وہ مجموعۂ اُردو چھپا یا چھُپا ہی رہے گا۔ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسر حد تقاضا پہنچا دیا ہے۔"[۴۱]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"اور ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم؟"[۴۲]

اور ایک اور خط میں بے خبر سے پوچھتے ہیں کہ:

"اجی حضرت، یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اُن سے کہیں۔"[۴۳]

حسن اتفاق دیکھیے کہ خواجہ غلام غوث بے خبر کا جواب بھی محفوظ ہے۔ وہ غالب کو لکھتے ہیں کہ میں الہ آباد سے مراد آباد جاتے ہوئے:

"میرٹھ ہو کر آیا۔ وہاں منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اُردو انشا، مجھے دکھائی، سب چھپ گئی، ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خاں صاحب نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں، کہ کوئی کہہ دے اُسے پھینک رکھا ہے۔ میں نے خاں صاحب کو لکھا تو ہے کہ قطعۂ تاریخ کا ہونا فرض نہیں، یوں ہی اس صفحے کو چھپوا کے کتاب تمام کر دیجیے، دیکھیے خدا

---

۴۱ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۶۶

۴۲ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۰

۴۳ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۸۹

کرے کہ وہ مان لیں:۲۲ے

منشی ممتاز علی خاں نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے، عودِ ہندی کو پھینک رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ خود قطعہ کہنے سے عاجز اور قاصر تھے۔ غالب کو اس کی اطلاع ملی کہ محض اس وجہ سے کتاب پڑی ہے۔ اُن کے لیے قطعہ کہنا کیا مشکل تھا، انھوں نے بطورِ دفعِ دخل، یہ قطعات کہہ کر فوراً منشی ممتاز علی خاں کو بھیجے ہوں تو کچھ عجب نہیں اور پھر ان قطعات میں بعض ایسی داخلی شہادتیں بھی ہیں جو ان قطعات کے تصنیفِ غالب ہونے کی مؤید ہیں۔ اس لیے قریب بہ یقین ہے کہ یہ انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان قطعات میں مدح کا جو ہلکا سا پرتو ہے، ممکن ہے وہ بعض طبائع کو، ان قطعات کے غالب کا نتیجۂ فکر ماننے میں مزاحم ہو۔ لیکن غالب کے لیے مدحِ خود یا خودستائی کوئی نئی بات نہیں اور پھر یہ کہ ان قطعات میں اُن کا نام نہیں تھا اور ان قطعات کو وہ اپنے نام سے چھاپ بھی نہیں رہے تھے، اس لیے اس میں کی مدح کی تو ذمہ داری بھی اُن کے سر نہیں تھی۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے ایک بات اور کہی ہے کہ "عودِ ہندی" کے:

"آخری قطعے کے مطالعے سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ منشی ممتاز علی خاں نے میور صاحب، (غالباً سر ولیم میور، گورنر مغربی و شمالی) کی خدمت میں "عود" کا مطبوعہ نسخہ نذر گزارنا تھا۔ سر ولیم میور علومِ مشرقیہ کے عالم تھے ... بے خبر نے جو "عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حاکم کے نام معنون کر کے اُس کے نشر و اشاعت کی

۲۲ے۔ فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

تکمیل پر مہرِ توثیق ثبت کریں۔ اُس زمانے میں اُردو زبان میں ایسی
نادر کتابیں معدودے چند شائع ہوئی تھیں۔گورنمنٹ بعض سیاسی
مصالح کے ماتحت نئی مفید کتابوں کی اشاعت میں انعام کے نام
سے یا امدادِ طبع کہہ کر اخراجات کا بار اٹھا لیا کرتی تھی، اس لیے بعید
نہیں کہ منشی (ممتاز علی خاں صاحب) کو بھی کچھ روپیہ مل گیا ہو۔"[۵۲۵]

خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث بے خبر، لفٹننٹ گورنر غرب و شمال کے میر منشی
تھے۔ اگر انتساب سے مقصود "کچھ روپیہ" حاصل کرنا ہی تھا تو بے خبر، بر بنائے عہدہ،
یا کہہ لیجیے کہ گورنر سے قربت کی بناء پر اس کا بلاتکلّفِ انتساب ہی شاید کچھ انتظام
کرا سکتے تھے۔ پھر منشی ممتاز علی خاں میرٹھ کے نامی رئیس تھے، وہ غالباً روپے پیسے
کی امداد کے ضرورت مند بھی نہ رہے ہوں گے اور تیسری بات یہ کہ غالب کے نام
بے خبر کے محولہ بالا خط میں تو بے خبر نے قطعے کے خیال ہی کو سرے سے زائد جانا یا
ہے۔ وہ میرٹھ گئے، منشی ممتاز علی خاں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اُن کے بھانجے نے
"عودِ ہندی" کی زیارت کرائی، کتاب سب چھپ چکی تھی۔ ایک صفحہ اخیر کا باقی تھا:

"خاں صاحب (ممتاز علی خاں) نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ
دے اسے پھینک رکھا[۵۲۶] تھا۔ اب ممتاز علی خاں سے چونکہ ملاقات نہیں ہوئی،
اس لئے بے خبر اُن کے لئے یہ تحریری پیغام چھوڑ آئے کہ:

"قطعۂ تاریخ کا ہونا فرض نہیں، یوں ہی اس صفحے کو چھپوا کے کتاب
تمام کر دیجیے۔"[۵۲۷]

---

[۵۲۵] مکاتیبِ غالب، طبع اوّل، بمبئی ۱۹۳۷، دیباچہ، صفحہ ۱۶۲

[۵۲۶] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

[۵۲۷] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

اس صورتِ حال میں مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ خیال کہ:

"بے خبر نے جو عود ہندی کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حکام کے نام معنون کرکے نشر و اشاعت کی تکمیل پر مہر توثیق ثبت کریں" [۴۸]

کچھ جی کو نہیں لگتا۔ بے خبر نے بظاہر ایسا کوئی مشورہ طابع کو نہیں دیا، بلکہ دستیاب مآخذ اور شواہد اس کے برعکس یہ ہیں کہ بے خبر نے قطعۂ تاریخ وغیرہ کے سرے سے بھیر میں پڑنے ہی کو زائد اور غیر ضروری امر قرار دیا تھا۔

"عودِ ہندی" کے انتساب میں خواجہ غلام غوث بے خبر کا کچھ دخل نہیں رہا، بلکہ میری رائے میں یہ خود غالب کے خاص شیوے کے عین مطابق ہے۔ فروری ۱۸۶۷ء میں "نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب" کے نام سے غالب نے ایک رسالہ "میکلوڈ صاحب بہادر" کی نذر کیا تھا:

"ارادہ کیا ہے کہ "پنج آہنگ" کی چوتھی آہنگ* جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے، اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ اوراق حضور پرنور ... جناب معلی القاب میکلوڈ صاحب بہادر فرماں روائے ممالک وسیعۂ پنجاب، بظاہر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر اور اُن کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان فلک رخش ہلال رکاب، کے نذر کیے جائیں۔ خدا کرے تجدد ترک جاہل کا بیان حضرت کے پسند آئے" [۴۹]

اس سے پہلے ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ غالب "صاحبان تازہ وارد ولایت" کے لیے اُردو کتاب تیار کرکے اُسے "میکلوڈ صاحب بہادر" کی نذر کر چکے تھے:

---

[۴۸] مکاتیب غالب، ایضاً، صفحہ ۱۷۲

* یہاں غالب کو سہو ہوا ہے۔ "آہنگ دوم" لکھنا چاہیے تھا۔

[۴۹] نکات غالب و رقعات غالب، طبع اوّل سراجی، دہلی ۱۸۶۷ء، صفحہ ۳

"یہ مجموعہ نذر اس جناب رفعت مآب کے ہے جس سے عزت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی ہے۔ صاحب والامناقب عالی شان۔ علم و اہلِ علم کے قدر دان ۔۔۔۔ عالی مرتبہ معلی القاب حضرت فلک رفعت میکلوڈ صاحب بہادر فنانشل کمشنر بہادر قلم رو پنجاب ۔۔۔ اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنی نذر کے قبول ہونے کا طالب ہے ۔۔۔۔ موسوم بہ اسداللہ خان و متخلص بہ غالب ہے۔" [۵۰]

ستمبر ۱۸۵۸ء میں غالب کی معروف کتاب "دستنبو" آگرہ میں زیرِ طبع تھی، انہی ایّام میں غالب نے ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کو منشی نبی بخش حقیر کو لکھا کہ میں نے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے، اسے بھی چاہتا ہوں کہ "دستنبو" کے آغاز میں شامل کر لیا جائے۔ "کتاب کو قصیدے سے عزت ۔۔۔۔ ہو جائے گی۔" [۵۱]

مختصر یہ کہ انگیز حکام کے اسم سامی سے انتساب غالب کی ایک خاص نفسیاتی الجھن تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ "عود ہندی" کے سر ولیم میور سے انتساب میں بھی یہی نفسیات کارفرما ہے کہ کتاب کو" اس سے "عزت" ہو جائے گی۔ اس سے غرض، طابع کی متوقع مالی مدد نہ رہی ہو گی اور "عود ہندی" کے طابع منشی ممتاز علی خاں میرٹھ کے نامی رئیس تھے، وہ روپے پیسے کے ضرورت مند تو یقیناً نہیں تھے، غالباً اس کے آرزو مند بھی نہ رہے ہوں گے۔

غالب "عود ہندی" کی اشاعت میں تاخیر سے شکستہ خاطر تھے۔ "مہر غالب" کے مادۂ تاریخ کے مطابق کتاب کی ابتدائی ترتیب کا کام چودھری عبدالغفور سرور کے ہاتھوں ۱۲۷۸ ہجری مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء میں پورا ہو گیا تھا، لیکن ۱۸۸ صفحات کی

---

[۵۰] انتخاب غالب، مرتبہ، محمد عبدالرزاق، چشتیہ پریس، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۲ء، صفحہ ۲

[۵۱] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۲، صفحہ ۹۱۵

اس کتاب کے چھپنے میں چھ سات سال لگ گئے۔ ممتاز علی خاں کے نام سے سرِ ایڈیٹر کی "نذر" میں یہ حکمت اور مصلحت کارفرما رہی ہو تو عجب نہیں کہ وہ کتاب کی اشاعت میں اس ذاتی حوالے سے شاید سرگرم اور مستعد ہو جائیں اور اس طرح غالب کو حق تصنیف کے کچھ زائد نسخے ممتاز علی خاں سے غالباً مل جانے کی بھی اُمید ہو۔ بے خبر کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"مجموعۂ (نثر اُردو)۔۔۔ چھپ چکا ہو تو حق تصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجئے[۴۱]"

"حق تصنیف" کے کتنے نسخے غالب کو ملے، اس سلسلے میں دستیاب مآخذ خاموش ہیں، لیکن چھپنے سے پہلے ہی "پنجاب احاطہ" میں کتاب کی بڑی مانگ تھی۔ احباب اس کے دل سے مشتاق اور طالب تھے، بلکہ بعض نے تو طالب کو بہ سرحد تقاضا پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ کتاب ابھی پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ نکلنا شروع ہو گئی۔ خواجہ غلام غوث بے خبر، ایک خط میں غالب کو لکھتے ہیں:

"مراد آباد میں اخبار "جلوۂ طور" کا مہتمم بھی وارد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے "عودِ ہندی کی" ویسے ہی ناتمام (بلا قطعۂ تاریخ) پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔"[۴۲]

خواجہ غلام غوث بے خبر نے "عودِ ہندی" کا مسودہ ترتیب دے کر اُسے کاتب سے خوش خط لکھوا کر اشاعت کے لیے منشی ممتاز علی خاں کو بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"اب اگر یہ مجموعہ طاقِ نسیاں میں رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہو گا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے۔ جب دیکھے گا کہ آپ

---

[۴۱] خطوطِ غالب، ایضاً جلد ۱، صفحہ ۴۷۰

[۴۲] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوالے گا اور جو نقل کے طالب ہوں گے، ان کو دے دے گا۔"[۵۴]

پنڈت مہیش پرشاد لکھتے ہیں کہ خواجہ غلام غوث بے خبر کی :

"اس تحریر کی بنا پر میں نے کوشش کی کہ خواجہ صاحب نے اپنا ذاتی کتب خانہ چھوڑا ہے، اس میں کہیں وہ نسخہ مل جائے، مگر خواجہ صاحب کے جو اعزہ بنارس میں ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا بے بہا سرمایہ بنارس میں ضائع ہو کر مفقود ہو چکا ہے۔ تاہم ہنوز کوشاں ہوں، ممکن ہے کہ کہیں وہ نسخہ دستیاب ہو جائے تاکہ اغلاط کی تصحیح یقین کے ساتھ ہو سکے۔"[۵۵]

۱۹۴۱ء میں پنڈت مہیش پرشاد نے الہ آباد سے "خطوطِ غالب" کی پہلی جلد شائع کی۔ ۱۹۵۱ء میں ان کے انتقال سے یہ کام جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اب اس اصل نسخے کا جو کبھی خواجہ غلام غوث بے خبر کی ملکیت رہا ہے، دستیاب ہونا بظاہر محالات میں سے معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ غلام غوث بے خبر نے غالبؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ نسخۂ "عود ہندی" کے لیے جگہ جگہ سے :

"آپ کی تحریریں فراہم کیں، خود سب کو دیکھا۔ جو مضامین مائق کے نہ تھے، ان کو نکال ڈالا۔"[۵۶]

پنڈت مہیش پرشاد کو "عود ہندی" کے مطبوعہ خطوں کا، غالبؔ کے بعض اصل

---

[۵۴] انشائے بے خبر، صفحہ ۴۸

[۵۵] ہندوستانی الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۴۶۵

[۵۶] انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱

قلمی رقعات سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا، اس کے نتیجے میں وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ ثابت ہوتا ہے کہ "عود ہندی" کے بعض خطوں کی کچھ عبارتیں قطع و برید کی زد میں ضرور آگئی ہیں۔"[۵۷]

اور اب "عود ہندی" کے سلسلے کی آخری بات، اس میں شامل خطوں کی مجموعی تعداد کے بارے میں، جس پر غالب شناسوں کا اتفاق نہیں ہے۔

پنڈت مہیش پرشاد[۵۸] اور مالک رام[۵۹] "عود ہندی" طبع اول کے خطوں کی تعداد ۱۶۸ بتاتے ہیں (۲۱ پہلی فصل میں، ۱۴۷ دوسری فصل میں)، مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ "عود ہندی" کے کل رقعات کی تعداد ۱۶۲ ہے۔[۶۰] مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ "عود ہندی" کے محض خطوط کی تعداد ۱۶۳ سے زیادہ نہیں۔[۶۱]

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے "عود ہندی" کو طبع اول کے مطابق مرتب کیا ہے۔ ان کے مرتبہ متن میں خطوں کی تعداد کا نمبر شمار ۱۶۶ ہے۔ "تعارف" میں فاضل لکھنوی نے 'فصل اول' کے خط ۲۱ اور 'فصل دوم' کے ۱۴۰ خط بتاتے ہوئے مجموعی تعداد ۱۷۱ قرار دی ہے۔[۶۲] آخر کتاب میں "فہرست مکتوب الیہم" کے تحت انھوں نے خطوں کی کل تعداد ۱۶۷ ظاہر کی ہے۔[۶۳] اس میں غالب کے نام بے خبر کے ایک خط

---

۵۷ ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۴۶۹

۵۸ ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۴۶۹

۵۹ ذکر غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۰۸

۶۰ مکاتیب غالب، طبع اول، بمبئی ۱۹۳۷ء دیباچہ، صفحہ ۱۷۲

۶۱ خطوط غالب، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء، جلد اول، صفحہ "ب" (گزارش احوال)

۶۲ عود ہندی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء، تعارف صفحہ ۹۸

۶۳ عود ہندی، ایضاً، صفحہ ۵۶۸

کو بھی شمار اور شامل کیا گیا ہے۔

حقیقتاً "عودِ ہندی" میں شامل خطوں کی کل تعداد ۱۷۷ ہے۔ ۴۱ پہلی فصل میں ہیں۔ اور ۱۳۶ دوسری فصل میں لیکن دوسری فصل میں ایک خط (صفحہ ۱۸۶۔۱۷۷) دراصل منشی غلام غوث بے خبر کا نوشتہ ہے اور غالب کے ایک خط (صفحہ ۱۷۸) کے جواب میں ہے۔ اسے شمار سے خارج کرتے ہوئے "عودِ ہندی" میں غالب کے خطوں کی کل تعداد ۱۷۶ بنتی ہے جو اکیس مختلف اصحاب کے نام ہیں۔

"عودِ ہندی" غالب کے انتقال سے قریب پونے چار مہینے قبل ۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو پہلی بار شائع ہوئی[۳۴] یہی غالب کی زندگی میں "عودِ ہندی" کا آخری ایڈیشن بھی ثابت ہوا[۳۵] پروفیسر حمید احمد خاں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ غالب کے:

"خطوں کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو غالب کی زندگی میں شائع ہوا۔ یہ دن صرف غالب کے سوانح نگار اور نقاد ہی کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ تاریخ نثرِ اردو میں ایک بڑے انقلاب کی خبر دیتا ہے۔ جو اسباب انیسویں صدی کے شروع میں

---

[۳۴] اخبار عالم، میرٹھ کی اشاعت ۲۲ اپریل ۱۸۶۹ء (صفحہ ۵) میں عودِ ہندی طبع اوّل پر یہ مختصر تبصرہ شائع ہوا ہے:

"یہ کتاب لطافت مآب بہ زبان اردو نثر جس میں اکثر خطوط اور مضامین مختلف بطور دیباچہ کتاب لکھے ہیں، نواب اسد اللہ خاں صاحب غالب مرحوم کے نتائج فکر سے ہے، جس کا مطالعہ واسطے صفائی اور درستی زبان اردو کے مفید اور کارآمد ہے۔ مطبع مجتبائی، واقع میرٹھ میں صاف اور خوش خط۔۔۔ ۱۸۸ صفحے

(بقیہ حاشیہ ۳۴، ۳۵ اگلے صفحہ پر)

اُردو نثر کے ظہور اور اس صدی کے نصف آخر میں اس کی ترقی کا باعث ہوئے، انھوں نے مل جل کر جدید اُردو نثر کی اس پہلی عظیم الشان اور مقبولِ عام کتاب کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔[۲۶]

(بقیہ حاشیہ)

کی ..... چھپی ہے۔ قیمت اس کی ایک روپیہ اور محصول ڈاک تین آنے ہیں۔"

بحوالہ: اُردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر ۲، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۴

۲۶ "عودِ ہندی" طبع اوّل (۱۸۶۸ء) کے بعد انیسویں صدی کی چار مزید اشاعتوں کے حوالے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں:

(i) عودِ ہندی مطبع نارائنی، دہلی ۱۸۷۸ء

(ii) عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۸۷۸ء

(iii) عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۸۷-۱۸۸۶ء

(iv) عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۹۰۰ء

۲۷ ادبی دُنیا، لاہور، دسمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳۳

غالب کی معدوم تصنیفات

"بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے"

[— اسد اللہ : نگاشتۂ بست وسوم فروری ۱۸۵۷ء]

قدر بلگرامی کے نام، اس خط کے لکھے جانے کے بعد، غالب بارہ برس اور جیے اور یہ زمانہ بھی شیوۂ قدیم کی ورزش میں گزرا — ساٹھ برس سے متجاوز اپنی ادبی زندگی کے طویل دور میں انھوں نے بہت کچھ لکھا، طبیعت کی اپج سے بھی اور فرمائش پر بھی — اردو میں بھی لکھا اور فارسی میں بھی، بہ صورت نظم بھی اور بہ پیرایۂ نثر بھی —

آج، کہ جب آلِ احمد سرور کے بقول غالب کی تحریر کا ایک ایک لفظ اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے، یہ جان کر بے حد ملال ہوتا ہے کہ غالب کی بعض تصنیفات و نگارشات اب تک پردۂ خفا میں ہیں — یہاں، غالب کی کچھ ایسی ہی تحریروں کا "ماتم" مقصود ہے، جن کا جہاں تہاں محض ذکر ملتا ہے لیکن جو تاحال دستیاب نہیں ہو سکی ہیں:

[۱]

میخانۂ آرزو سرانجام

سالِ ترتیب: ۱۸۳۵ء

نواب الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبزادے یعنی غالب کے برادرِ نسبتی

میرزا علی بخش رنجور[1] نے "پنج آہنگ" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے عم مرحوم فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر کے خلفِ اکبر نواب شمس الدین کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے کے بعد ۱۲۵۱ھ کے آغاز میں جے پور سے دہلی پہنچے اور غالب سے ملے۔ انہی ایام (۱۸۳۵ء) میں غالب کا دیوان بعنوان "میخانۂ آرزو سرانجام" تازہ فراہم ہوا تھا۔ اس میں کی نثر کو رنجور نے غالب سے سبقاً پڑھا تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ دیوان سے "ہمگی نثر" یک جا کریں لیکن ایک عرصے تک ہجومِ افکار اور وفورِ آلام کے ہاتھوں فرصت میسّر نہ آئی، یہاں تک کہ . . . . .

میرزا علی بخش کے لفظ یہ ہیں :

"در آغازِ سالِ یک ہزار و دوصد و پنجاہ و یک ہجری شمس الدین خاں را بقضائے آسمانی آن پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد و آن خود از غایت شہرت بشرح احتیاج ندارد و بعدِ آن ہنگامہ ہم دران ہنگام از جے پور بہ دہلی رسیدم و بکاشانۂ برادرِ والاشان و آموزگارِ مہربان غالب زاد افضالہ فرود آمدم۔

چون دران ایام دیوانِ فیض عنوان کہ مسمّٰی بہ میخانۂ آرزو سرانجام است تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود، آنچہ از نثر دران ہمایوں

---

[1] میرزا علی بخش ایک طرف غالب کے حقیقی برادرِ نسبتی تھے، دوسری طرف اُن کی شادی غالب کی بھانجی (بانی خانم) سے ہوئی تھی۔ میرزا علی بخش نے "پنج آہنگ" کے دیباچے میں اس دو آتشہ قرابت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :

"درمیان این نحیف (رنجور) وآں سخنور یکتا (برادرِ قدس اثر جناب اسداللہ خاں متخلص بہ غالب) از دو سو پیوندِ قرابت استوار است و محبت و مودّت کہ غازۂ رخسارۂ قرابت ہمان تواند بود بسیار است۔"

صحیفہ صورت ارقام داشت ' ہمہ را بحدمت والا ے آں خسرو اقلیم خسروی خواندم - بخاطر چناں گزشت کہ ہمگی نثر از دیوان برچیدہ یکجا کنم . . . . .
از ہجوم افکار و وفور آلام فرصت میسر نمی آمد تا آنکہ . . . .

رنجور کے اس بیان میں غالب کے جس دیوان بعنوان " میخانۂ آرزو سرانجام " کا ذکر آیا ہے ، وہ اب معدوم ہے - رنجور کا کہنا ہے کہ ۱۲۵۱ ہجری کے آغاز میں نواب شمس الدین خاں کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے کے بعد وہ جے پور سے غالب کے ہاں دہلی پہنچے تو یہ دیوان تازہ فراہم ہوا تھا -

اس بیان کی روشنی میں اس معدوم دیوان کے زمانۂ ترتیب کے بارے میں کچھ باتیں کہی جا سکتی ہیں — ایک بات جو قطعی یقینی ہے یہ کہ زیر بحث دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہوا — اور دوسری بات یہ کہ اس کی ترتیب ۱۸۳۵ء میں اپریل اور اکتوبر کے زمانے میں کسی وقت عمل میں آئی -

سال ترتیب اس لیے یقینی ہے کہ ۱۲۵۱ ہجری مطابق ہے ۱۸۳۵ء کے -- اپریل سے اکتوبر تک کا قرینہ کچھ تفصیل چاہتا ہے — پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ۱۲۵۱ ہجری کا آغاز مطابق ہے ۲۹- اپریل ۱۸۳۵ء کے — " اکتوبر" کی حد نواب شمس الدین کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے سے وابستہ ہے ، جس کا قصہ یہ ہے کہ اُن دنوں ولیم فریزر (WILLIAM FRASER) دہلی کے کمشنر تھے جو ۲۲- مارچ ۱۸۳۵ء کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان قتل ہوئے [۲] اور بوجوہ نواب شمس الدین احمد خاں اس قتل میں ماخوذ ہو کر ۸- اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی پا گئے [۳]
میرزا علی بخش ، نواب شمس الدین احمد خاں کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے کے بعد

---

2. MURDER OF COMMISSIONER FRASER — DELHI, 1835. BLACK WOOD'S EDINBURGH MAGAZINE, VOL. CXXIII, No. DCCXLVII, JANUARY 1875, PP. 32.

۳- ذکر غالب ، مالک رام ، طبع پنجم ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ، فروری ۱۹۷۶ء ، ص ۵۲ -

جے پور سے دہلی پہنچے اور غالب کا تازہ فراہم دیوان "میخانۂ آرزو سرانجام" دیکھا ـــــ "قضائے آسمانی کا شکار ہونے سے" میرزا علی بخش کی مراد نواب شمس الدین کے مقدمۂ قتل میں ملوث و ماخوذ ہونے سے ہے، تو یہ اپریل ۱۸۳۵ء کی بات ہے اور اگر "قضائے آسمانی کا شکار ہونے" سے اُن کی مراد نواب شمس الدین کے پھانسی پا جانے سے ہے تو یہ اکتوبر ۱۸۳۵ء کا سانحہ ہے ـــــ حاصلِ کلام یہ کہ "میخانۂ آرزو سرانجام" کا زمانۂ ترتیب ۱۸۳۵ء میں اپریل یا اکتوبر کے پس و پیش قرار پاتا ہے۔

لیکن افسوس۔ ـــ کہ "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام یا عنوان سے غالب کا کوئی مجموعہ اب دستیاب نہیں ـــــ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ:

"غالب نے اپنے کلیاتِ نظم فارسی کا نام "میخانۂ آرزو سرانجام" رکھا تھا، لیکن اس کا کوئی ایسا نسخہ نہیں ملتا جس میں یہ نام مرقوم ہو۔ علی بخش خاں دیباچہ نگار "پنج آہنگ" کا قول ہے کہ شمس الدین خاں کے، اوائل ۱۲۵۱ھ میں پھانسی پانے کے کچھ ہی بعد وہ جے پور سے دہلی واپس گئے تو اس زمانے میں "تازہ تازہ فراہم" ہوا تھا۔ یہ نسخہ جو اُن کے پیشِ نظر رہا تھا، اب ناپید ہے"

[اُردوئے معلّیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء، ص۲]

مسلم ضیائی کا کہنا یہ ہے کہ:

"غالب کی بیدل پسند اور جدت طراز طبیعت سے بعید نہیں کہ اُنھوں نے اپنے اوّلین مجموعۂ نظم و نثر کا نام "میخانۂ آرزو سرانجام" رکھا ہو ـــ لیکن ابھی تک اُن کا کوئی ایسا مجموعہ دستیاب نہیں ہوا جس پر یہ نام لکھا ہو۔"

[اُردو، کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء، ص۱۱۵]

سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے میرزا علی بخش کے حوالے سے "میخانۂ آرزو سرانجام" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ دیوان یا کسی دیوان پر یہ نام ابھی تک دیکھنے اور سُننے میں نہیں آیا۔
میرے خیال میں شاید اس نام کی حیثیت "پرتوستان" جیسی ہے، یعنی دیوان
پر یہ عنوان نہ لکھا جا سکا۔"

[پیش گفت : دیوانِ غالب فارسی' لاہور' جون ۱۹۶۷ء' جلد ا ص۱۰]

"میخانۂ آرزو سرانجام" کو قاضی عبدالودود نے "کلیاتِ نظم فارسی" اور مسلم ضیائی نے
"اولین مجموعۂ نظم و نثر" بتایا ہے۔ فاضل لکھنوی "دیوان" کے اس نام کو محض ہوائی ٹھہراتے
ہیں ـــ یہ بہر حال طے ہے کہ "میخانۂ آرزو سرانجام" اب معدوم ہے۔

[۲]

رسالہ در آئینِ پیچہائے بانک

زمانۂ تالیف : ماقبل ۱۰۔مارچ ۱۸۴۵ء

غالب کے مجموعۂ نظم و نثر فارسی "باغِ دودر" (مرتبۂ : سید وزیر الحسن عابدی) سے
ایک بڑی نادر اطلاع یہ ملتی ہے کہ غالب نے بانک کے داؤپیچ پر بھی ایک مختصر کتاب
تالیف کی! یہ ایک اُردو رسالے کا فارسی ترجمہ ہے جسے غالب نے ٹونک کے نواب وزیر محمد خاں
کی خوشنودیِ مزاج کے خیال سے ترتیب دیا۔

یہ رسالہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس نشاندہی اور اطلاع کا واحد ماخذ
"باغِ دودر" میں شامل غالب کا ایک خط ہے جو اگست ۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔
اور ایک اندازے کے مطابق ۱۸۴۵ء کی پہلی سہ ماہی میں کسی وقت لکھا گیا۔

"باغِ دودر" کے دوسرے حصے "منثورات" میں مختلف اصحاب کے نام غالب کے ساٹھ خط شامل ہیں۔ چوبیسویں خط میں جو تفضل حسین خاں خیرآبادی کے نام ہے غالب نے اپنی اس تالیف کا ذکر ان کلمات میں کیا ہے :

"...... اغلب کہ حضرت نیز زود نہ دیرانہ آگرہ بہ ٹونک بہ ہمراہی شوند۔ و چون بدان خجستہ منزل رسند، این نامہ کہ تحویل طالع یارخاں[کہ] است از نظر گذرد۔ نهفتہ مماناد کہ این بار طالع یارخاں کہ دوست دیرینۂ منست بارگرانی بردوش من نهاد۔ بپارسی ترجمہ کردن ہندی عبارتی را کہ بگزارش آئین سپہبای بانگ مشتمل بود۔ ازمن خواست و سرانجام این خدمت را ذریعہ خوشنودی خاطر خطیر حضرت نواب معلی القاب عالی جناب وانمود۔ چون زلہ خوار خوان جود آن والا جاہ بودم و سپاس میبایست گزارد۔ توسنِ خامہ را دران گزرگاہ تنگ بجولان آوردم و سفینہ کہ دیباچہ وخاتمہ نیز دارد ترتیب دادہ بہ کارفرما سپردم و عرضداشتی بران افزودم تا روایی آرزوی در دو توقیع را بہانہ تواند بود۔

داد خوبی عنوان دیباچہ از شما اولاً و از مطاعی ومخدومی حضرت مولوی ظہور الدین علی دامت برکاتہ، ثانیاً می خواہم کہ تا بنگرند و دریابند کہ ممدوح را دران دیباچہ بکدامی زبان و در ستائش فن بانگ کہ حقیقت آن پیداست کہ چیست، سخن را بکدام پایہ بردہ ام۔ با این ہمہ چہ در دیباچہ وچہ در جریدہ نوی طرزِ نگارش و نوآئینی ہنجار گزارش از دست نرفتہ وگفتار ہم چناں بر روش خاصہ خویش برجای ماندہ است۔ با این ہمہ کہ گفتم دانم کہ نازش من در سحر طرازی آن زمان رواست و داد جانگدازی

[کہ] طالع یارخاں کے کوائف میں دیکھیے سید جمیل الدین احمد کا مضمون مطبوعہ: نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۵ء

خوش آں وقت یافتہ باشم کہ بندگانِ رفیع الشان نواب سلطان نشان گفتارِ مرا پسندند"

[باغِ دو در، طبع ثانی، لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۵-۱۲۰]

تحقیق نامۂ "باغِ دو در" میں وزیر الحسن عابدی نے اُردو میں اس فارسی عبارت کی ترجمانی پیش کی ہے، جس کا یہاں نقل کر دینا بے محل اور لطف سے خالی نہ ہوگا:

"...... شاید آپ (تفضل حسین خاں خیرآبادی) بھی جلد ہی آگرے سے ٹونک روانہ ہونے والے ہوں اور وہاں پہنچ کر یہ عریضہ جو طالع یار خاں کو دے رہا ہوں، آپ کی نظر سے گزرے — اس دفعہ طالع یار خان نے جس سے میرے دیرینہ مراسم ہیں، مجھ سے ایک بڑے مشکل کام کی فرمائش کی۔ بانک کے داؤ پیچ پر ایک مختصر ہندی (اُردو) رسالے کا فارسی میں ترجمہ کرنے کو کہا اور یہ مشورہ دیا کہ اس خدمت کی انجام دہی نواب عالی القاب (نواب صاحب، ٹونک ـ نواب وزیر محمد خاں) کی خوشنودیٔ مزاج کا سبب ہو گی۔ میں چونکہ ان کے خوانِ جود و کرم کا زلہ خوار ہوں اور سپاسِ نعمت مجھ پر فرض ہے، میں نے اس مشکل کام کے لئے قلم اٹھایا اور ایک رسالہ دیباچے اور خاتمے پر مشتمل ترتیب دے کر انھیں (طالع یار خاں) کو دے دیا اور ایک عرضداشت بھی لکھ کر ساتھ کر دی" تاکہ اس وسیلے سے یہ آرزو بر آئے کہ نواب صاحب کی توقیع میرے نام صادر ہو۔

دیباچے کے مضمون کی داد پہلے آپ سے اور پھر مخدومی (حضرت) مولوی ظہور الدین علی سے چاہتا ہوں کہ ممدوح کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے اور فنِ بانک کی تعریف کس انداز میں کی ہے اور اس کے ساتھ دیباچے اور رسالے کی عبارت میں اسلوبِ بیان کی جدت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ بیان کا خاص

اسلوب برابر قائم رہا ہے۔ بایں ہمہ جانتا ہوں کہ اپنی جادو بیانی پر فخر اُس وقت کر سکتا ہوں اور مجھے اپنی کاوش کی داد اس وقت ملے گی کہ بندگانِ نواب صاحب سلطان نشان میرے انداز کو پسند فرمائیں۔"

[تحقیق نامہ باغِ دودر، مطبوعہ لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۵۱۔۵۲]

تفضل حسین خاں خیرآبادی کے نام باعتبارِ ترتیب، یہ غالب کا دوسرا خط ہے اور اس پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ تفضل حسین خاں ہی کے نام "باغِ دودر" میں شامل اگلے (باعتبارِ ترتیب تیسرے) خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نوابِ ٹونک نے غالب کی اس عرضداشت کا جو رسالہ "در آئین پیچہائے بانک" کے ساتھ بھیجی گئی تھی، کوئی جواب نہیں دیا۔ غالب نے اس رویے کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور بے حد ملول ہوئے[۵] ۔ اس خط پر یکم ربیع الاول ۱۲۶۱ھ کی تاریخ درج ہے جو مطابق ہوتی ہے ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ء کے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بانک کے داؤ پیچ سے متعلق رسالے کے ترجمے اور ترتیب و تالیف کا کام مذکورہ تاریخ (۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ء) سے کچھ پہلے انجام پایا ہوگا۔

بانک کے داؤ پیچ کے فن پر غالب کا رسالہ اب معدوم ہے۔ مالک رام نے اپنے بعض احباب کے ذریعے سے ٹونک میں اس کتاب کے مسودے کی تلاش کی کوشش کی تھی لیکن انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی[۶] ۔ عجب نہیں کہ غالب کی یہ ادبی یادگار ٹونک میں یا

---

۵ غالب کے اس خط (مرقومہ ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ء) کی برگشتگی دیدنی ہے۔ اس سے غالب کے اُفتادِ مزاج پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کی خود نگری کی بڑی تیکھی اور منہ بولتی تصویر سامنے آتی ہے۔ خط کے اصل فارسی متن اور اردو ترجمے کے لیے دیکھیے بالترتیب:

۱۔ باغِ دودر، مرتبہ: وزیر الحسن عابدی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۶۔ ۱۲۸

۲۔ تحقیق نامہ باغِ دودر، ص ۵۲۔ ۵۵

۶ ذکرِ غالب، طبع پنجم، دہلی، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۱۵۹

کہیں اور، کسی ذخیرۂ کتب میں محفوظ لیکن دبی پڑی ہو اور حُسنِ اتفاق یا تلاش سے کبھی دستیاب ہو جائے۔

[۳]

قصّہ کہانی کی کتاب (اُردو)

فی بطنِ شاعر، بزمانہ: دسمبر، یا بعد، ۱۸۵۸ء

غالب کے خطوں میں ایک اور کتاب کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا اور قیاس کہتا ہے کہ یہ لکھی نہیں گئی، محض تجویز کی حد تک ہی رہ گئی۔ غالب سے اس کی فرمائش ہنری اسٹورٹ ریڈ٭ نے کی تھی۔ فرمائش یہ تھی کہ وہ اردو نثر میں ایک مستقل کتاب لکھ دیں۔ منشی شیو نرائن آرام کے نام ۱۱۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے اول اول اس فرمائش کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکا۔ اُن کی فرمائش ہے: اردو کی نثر.... وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر بھائی، غور کرو، اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صَرف

٭ ہنری اسٹورٹ ریڈ (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن صوبہ شمال مغربی) کا ذکر غالب کے خطوں میں سب سے پہلے مرزا تفتہ کے نام ۲۷۔ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں آیا ہے:

"ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ممالکِ مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔"

گارسین دتاسی نے اپنے خطبات میں ریڈ کا ذکر اکثر کیا ہے۔ خصوصیت سے دیکھیے بارھواں خطبہ، ۲۔ دسمبر ۱۸۶۱ء۔

کروں گا ؟ اور اس عبارت میں معانیِ نازک کیوں کر بھر دوں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں ؟ کون سی بات ؟ کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں ؟ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ ...... ؟"

چار روز بعد ہی، ۵۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں، اپنے اس خط کے جواب کا تقاضا کرتے ہوئے، غالب لکھتے ہیں :

"بھائی، یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔ تمہارا خط آیا، اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھجوایا۔ آج تک تم نے اس کا جواب نہ بھیجا۔ حالانکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں یعنی ..... رنڈ صاحب کے باب میں، میں نے یہ لکھا تھا کہ جب کچھ اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش۵ کروں گا۔ معہٰذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اُردو کروں۔ تم نے اس بات کا بھی جواب نہ لکھا۔"

اس یاددہانی کے تین روز بعد، منشی شیونرائن آرام کا خط آ گیا۔ اسی روز ۱۸ اگست ۱۸۵۸ء کو غالب نے اس کا جواب تحریر کیا :

"برخوردار، آج اس وقت تمہارا خط ..... آیا۔ دل خوش ہوا...

---

۵ شیونرائن، کہ "دستنبو" کے ناشر تھے، اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، جلد نکل جائے۔ یہاں "خریداری کی خواہش" سے مراد ہے کہ ہنری اسٹورٹ رِیڈ اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لیے "دستنبو" کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ "اپنے لیے" ایک نسخہ خرید یں! اُن کے ذاتی ملاحظے کے لیے تو شیونرائن اور غالب دونوں، الگ الگ "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے۔ دیکھیے مرزا تفتہ کے نام غالب کا خط، مرقومہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء

... جناب ریڈ صاحب، صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کرسکتا ہوں۔ تین مہینے میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؛ بہت ہوگا کہ میرا اُردو، بہ نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہوگا۔ خیر، بہرحال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زورِ قلم دکھاؤں گا ....."

مراسلت کے اس اسلوب سے یہ خیال ہوتا ہے کہ غالب سے اُردو نثر میں قصّے کہانی کی کتاب تالیف کرنے کی یہ فرمائش منشی شیو نرائن کے توسط سے بھی کی گئی ہوگی، جنہوں نے اسی زمانے میں "دستنبو" کا ایک نسخہ، اس کے چھپتے ہی اپنے مطبع مفید خلایق کی طرف سے ہنری اسٹورٹ ریڈ کی نذر کیا تھا۔

کتاب اور اس کے مجوّز، ریڈ صاحب کا ذکر یا اشارہ، غالب کے ہاں، قریب بعد کے صرف ایک خط میں اور آیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اُردو نثر میں قصّے کہانی کی کتاب ترتیب دینے کا وقت نہیں نکال سکے..... یا زیادہ صحیح یہ، کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لیے آمادہ ہی نہ ہو پائے۔

اوائل جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں، وہ ضمناً ریڈ صاحب کا ذکر کرنے کے بعد منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

"میاں، اُردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو؟ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب نام کو میرے پاس نہیں، پنسن مل جائے، حواس ٹھکانے ہوجائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پڑیں روٹیاں، تو سبھی گلاں موٹیاں۔ زیادہ ـ زیادہ .....

روز سہ شنبہ، ۲۔ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء

مابعد، اس مجوزہ کتاب کا ذکر یا سراغ، غالب کے کسی اور خط میں نہیں ملتا۔ انھوں نے پنشن مل جانے پر، اس کتاب کی "فکر" کو موقوف رکھا تھا..... پنشن کی اجرائی، اس

ارادے کے پورے ایک سال چار ماہ بعد، بہت کھکھیڑیں اُٹھانے پر، کہیں ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو عمل میں آسکی۔ لیکن "تواس ٹھکانے ہو جانے" اور "پیٹ پڑیں روٹیاں" والی شرط پھر بھی پوری نہ ہو پائی۔ اس لیے کہ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، یک مشت ملنے پر وہ بہت ضروری قرض ادا کرنے کے بعد (جسے غالب نے "ادائے حقوق" کہا ہے) چار سو روپے ان کے ذمّے دینے باقی رہے، اور ان کے پاس صرف ستاسی روپے گیارہ آنے بچے[10] ..... اور یہ بھی بہت رگڑ جھگڑ کر انہیں بچے، ورنہ ان کا قرض خواہ اور مختارِ کار خزانے سے روپیہ لے آیا تھا اور اپنا حساب صاف کرائے بغیر، اس کی ہوا تک دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی زمانے میں مجروح کو لکھتے ہیں :

"..... خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا[11] ....."

اور ایسے میں اردو نثر لکھنے کی، برس ڈیڑھ برس پہلے کی فرمائش کا انجام معلوم! اور پھر خصوصیت سے ایسی فرمائش جسے وہ اپنے "منصب" سے ویسے ہی فروتر خیال کرتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "منتخباتِ اُردو" کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۱ء کی چھپی ہوئی ایک کتاب موجود ہے، جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے :

" منتخباتِ اُردو..... یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان کے واسطے

---

[9] خطوطِ غالب، مرتبہ، مالک رام، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۷

[10] خطوطِ غالب، مالک رام، صفحہ ۳۰۱

[11] ایضاً، صفحہ ۳۱۵

کلکتہ یونیورسٹی کے جناب وائس چانسلر صاحب بہادر اور صاحبانِ سنڈیکیٹ کے ارشاد کے مطابق بہدایت اور اعانت جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی کے، مولوی محمد کریم بخش میر منشی محکمۂ مذکور نے تالیف کی[۲۲]......"

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ریڈ صاحب نے غالب سے اسی نصابی کتاب کی تالیف یا اس کے لیے کسی ایک قصّے کی تصنیف کی فرمائش کی ہو گی۔

[۴]

اُردو زبان کے ظہور کا حال

زمانۂ تالیف: ۱۲۸۲ھ، ۶۶-۱۸۶۵ء

غالب کے عزیز دوست صاحب عالم مارہروی (۱۷۹۶ء - ۱۸۷۱ء) کے نواسے صفیر بلگرامی[۲۳] ۱۲۸۰ھ - ۶۴-۱۸۶۳ء میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے اور دو سال بعد

[۲۲] مؤلف مولوی محمد کریم بخش میر منشی محکمۂ مذکور کے بارے میں معلومات کے لیے رجوع کیجیے، مقالہ از ملا احمد نواز مطبوعہ: قومی زبان، کراچی، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۸ - ۲۲

[۲۳] صفیر بلگرامی، سید فرزند احمد: ۹- اپریل ۱۸۳۴ء (۲۸- ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) کو اپنی ننھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات ان کی یادگار ہیں، جن میں تذکرۂ "جلوۂ خضر" اور دس جلدوں میں "بوستانِ خیال" کا اُردو ترجمہ بہت مشہور ہیں۔ اُردو کے آٹھ دیوان تھے، دو زندگی میں چھپ گئے تھے، تین دیوان فارسی کے تھے، چار فارسی کی مثنویاں اور چھبیس اُردو کی۔ قصائد، رباعیات، قطعات اور واسوختوں کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں۔ بروز دوشنبہ، ۱۱- مئی ۱۸۹۰ء (۲۱- رمضان ۱۳۰۷ھ) کی دوپہر کو پٹنہ میں انتقال کیا اور آرہ میں مدفون ہوئے۔

(مالک رام، تلامذہ غالب، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۳-۱۹۵)

مئی ۱۸۶۶ء میں ایک طویل سفر کر کے مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور بہت دن تک ان کے پاس مقیم رہے۔ صفیر بلگرامی نے اپنی ملاقات کا حال "جلوۂ خضر" میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس روداد سے غالب کی ایک تصنیف اُردو زبان کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کی مختصر تاریخ کی نشاندہی ہوتی ہے:

"...... مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں اپنے ایک رسالے کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا، ہاتھ میں لے لیے۔ حضرت نے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو، یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر[۱۴] صاحب لکھی ہے۔ اس میں اردو شاعری کی مختصر تاریخ اور کچھ تو اعد تھے۔ کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا۔ جناب ڈائرکٹر صاحب نے مؤلف (جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی) کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا[۱۵] تھا کہ

۱۴۔ مُراد ڈائرکٹر میتھیو کیمپسن سے ہے جو علم دوست شخص تھے۔ اُردو اور فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے "فسانۂ مبتلا" کے دیباچے (اگست ۱۸۸۵ء) میں کیمپسن کی معارف پروری کی ستائش کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "توبۃ النصوح" ایڈیشن ۱۸۸۶ء کے سرورق کے حوالے سے ایک موقع پر لکھا ہے کہ کیمپسن ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۸ء تک ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے (صحیفہ، لاہور، شمارہ ۵۱، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۱۱) — لیکن ایک مُقدّم اور معاصر اطلاع کے مطابق کیمپسن وسط مارچ ۱۸۶۶ء میں رُخصت فرلو پر تشریف لے گئے اور آر۔ ٹی۔ ایچ۔ گریفیتھ (R. T. H. Griffith) نے عہدۂ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اضلاع شمال و مغرب کا چارج لے لیا۔ دیکھیے "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ" جلد ۱، نمبر ۱۹، جمعہ، ۱۶ مارچ ۱۸۶۶ء ص ۱۵۵۔

۱۵۔ ڈائرکٹر ایم۔ کیمپسن کا اصل خط ڈاکٹر مختارالدین احمد نے احسن مارہروی کے اخلاف کے یہاں دیکھا اور اسے اپنی تالیف "احوال غالب" (۱۹۵۳ء) میں نقل کر دیا ہے (ص ۲۰۵-۲۰۶)۔ اس خط سے بعض متعلقہ امور پر روشنی پڑتی ہے اور قیاس غالب ہے کہ مرزا غالب کو بھی اسی خط کی نقل بھیجی گئی ہوگی۔ اس لیے یہاں پورا خط درج کیا جاتا ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

زبانِ اُردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے۔ چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کرکے بھیج دیا تھا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا۔ اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے۔ الغرض اسی رسالے کے پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا......" [صفیر بلگرامی "جلوۂ خضر" مطبوعہ نور الانوار۔ آرہ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء حصۂ اول، ص ۲۲۵ - ۲۲۶ در ذکرِ مومن]

(گزشتہ صفحے سے پیوستہ)

عنایت فرمائے دوستاں سید صاحب عالم معانی دارد مارہرہ زاد عنایتکم

بعد اظہارِ شوق و مراسمِ عرفیہ کے واضح رائے محبت پیرائے ہو، چونکہ اکثر اوصافِ جمیلہ و محامدِ جلیلہ آپ کی درباب واقفیتِ تاریخ و زبان دانی و دیگر فضائل و کمال کے گوش زد ایں جانب ہوئے، اس لیے آپ کو بپاسِ دوستانہ اس امر کی تکلیف دی جاتی ہے کہ اگر آپ کو حال مفصل ایجادِ زبانِ اُردو معلوم ہو تو اس کی کیفیت تحریر کرکے مجھے ممنون کیجئے اور اس تحقیقات سے وہ دریافت حال زبانِ مسطورہ مطلوب ہے کہ جس سے حال زمانۂ ابتدائے اجرائے اُردو اور نیز تصریح اس امر کی کہ کس عہد سے زبانِ مذکورہ داخل نوشت و خواند اہلِ ہند ہوئی، معلوم ہو جائے اور کن کن استادوں نے زبانِ مذکور میں ابتدا شعر و سخن یا نثر کے مضامین لکھنے شروع کیے اور کتنے محاوراتِ قدیمہ اب تبدیل ہو گئے، اور اس تبدیلی سے اس زبان میں آیا شستگی و رفتگی آئی یا کسی طرح کا نقص پیدا ہوا اور اگر کلام ان اساتذۂ قدیم کے یاد ہوں یا کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو بطور مشتے نمونہ از خروارے سلکِ تحریر فرما کر ممنون کریں اور جو کوئی کتاب حاوی ان امور کی مل سکے اس کو بطور عاریت یا بہ قیمت جیسا مناسب ہو (عطا) فرمائیں، نہایت موجبِ احسان مندی ہوگا ــــ اور چونکہ جس کتاب کا ایں جانب کو قصدِ تالیف ہے اور جس کی امداد کے لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے اُس میں حال شعراء وغیرہ کا بقیدِ نام و مسکن و زمانہ لکھا جائے گا۔ آپ جو کیفیت ان اُستادوں کی تحریر فرمائیں تو اس میں امرِ صدر کا ضرور لحاظ رہے۔ فقط

المرقوم ۲۶ جون ۱۸۶۶ء
کیمپ، کوہ منصوری

رقیمۃ الشوق
ایم۔ کیمسن

خود غالب کے ایک خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب نے ڈائرکٹر تعلیمات میتھیو کیمپسن کی فرمائش پر اُردو زبان کے ظہور کا حال لکھا تھا۔ دوشنبہ، ۲۳۔ جولائی ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

"جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارسِ غرب وشمال کا باوجود عدم تعارف، خط مجھ کو آیا۔ کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا، اس کا جواب لکھ بھیجا نظم ونثر اُردو طلب کی تھی مجموعۂ نظم بھیج دیا، نثر کے باب میں .... لکھا کہ ..... مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع وحصولِ اطلاع ..... منگاکر بھیج دوں گا ......"

لیکن ڈاکٹر مختار الدین احمد کا خیال ہے کہ:

"غالب نے اُردو زبان کی تحقیق میں کوئی رسالہ پانچ چھ جزو کا لکھا تھا، یہ محل نظر ہے۔ صفیر کے علاوہ اس رسالے کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ خود غالب کی تحریروں میں اس کا پتا نہیں۔ اس قدر اہم موضوع پر اُن کی کوئی تصنیف ہوتی تو اور معاصرین بھی اس کا ذکر ضرور کرتے اور وہ کتاب اس قدر جلد فنا بھی نہ ہوجاتی۔ خود غالب کے ایک خط (مذکور الصدر) بنام خواجہ غلام غوث بے خبر سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے ـــ قابلِ غور امر یہ ہے کہ غالب کسی کتاب کی تصنیف کا ذکر نہیں کرتے: "خط مجھ کو آیا ..... اس کا جواب لکھ بھیجا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کے جواب میں ایک خط لکھ دیا۔ ممکن ہے وہ خط کچھ طویل ہو، لیکن پوری کتاب لکھی ہو، یہ قرینِ قیاس نہیں۔" [احوالِ غالب، صفحہ ۴۲، بہ بعد]

غالب کے خط سے "صاف" تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ "بس" کیمپسن کے "جواب میں ایک خط لکھ دیا" ہو۔ کیمپسن کے استفسار تفصیل طلب تھے، ان کے جواب "پانچ چھ جزو" سے کم میں سما بھی کیا سکتے تھے۔ غالب نے بالصراحت اگر مذکورہ خط میں "کتاب یا رسالے"

کا لفظ استعمال نہیں کیا، تو اس کے لازماً یہ معنی نہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر استفسارات کے جواب کی فرمائش میں، کوئی کتاب یا رسالہ تصنیف بھی نہ کیا ہو، اِلّا یہ کہ واقعی خارجاً کسی معتبر ذریعے سے اس کی تردید ہوتی ہو۔ اس کا بارِ ثبوت ابھی باقی ہے، جب کہ اس کے بالعکس ایک معاصر عینی شہادت موجود ہے۔ اس لیے یہ نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ غالب نے اُردو زبان کی ابتدا اور اس کی نشوونما کی مختصر تاریخ مع اضافہ قواعدِ اُردو لکھی۔ وہ کہیں نہ کہیں ضرور پڑی ہوگی، اگر دستِ بُردِ زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد نہیں ہو چکی۔

قاضی عبدالودود نے ایک موقع پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "صرف و نحو پر ان (غالب) کی کوئی مستقل جامع کتاب نہیں باقی تو اب نایاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "جلوۂ خضر" میں غالب کے قواعدِ اُردو کا ذکر ہے مگر مجھے اس کے وجود میں شبہ ہے[۵۵]" کتاب کا وجود قاضی صاحب کے نزدیک مشتبہ لیکن اس کی ناپیدگی بہر طور یقینی ہے — دونوں صورتوں میں "جامع" کی قید زائد ہے اور بلا دلیل "شبہ" ایک معاصر عینی شہادت کی موجودگی میں تکلفِ محض ہے۔

[۵]

ناتمام اُردو قصہ

تالیف: فروری ۱۸۶۹ء

"یادگارِ غالب" میں حالی نے غالب کی "نثرِ اردو" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "۔ ۔ ۔ ۔ مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ ۔ ۔
> اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔"

لیکن حالی کی اس نشاندہی اور شہادت کے باوجود مجھے اس میں تامل ہے کہ غالب نے مرنے سے چند روز پہلے کوئی اُردو قصہ لکھنا شروع کیا ہوگا۔ اس لیے کہ دوسری

---

۵۵ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۵۵ (متن و حاشیہ)

طرف خود حالی ہی کے بقول :

"...... مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے...."

○

"...... مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔"

○

"..... آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے... بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزو مند تھے۔"

○

"..... جس روز انتقال ہوا، اُس سے شاید ایک روز پہلے، میں اُن کی عیادت کو گیا تھا۔ اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا، اُس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا :

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔"

○

"..... مرنے سے پہلے، اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا :

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے

عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

" اخیر عمر اور مرض الموت کی حالت " کے تحت حالی کے یہ بیانات منظر ہیں کہ آخر آخر، غالب کی حالت اتنی خستہ و خراب ہو چکی تھی کہ خط وغیرہ کا جواب وہ خود نہیں لکھ پاتے تھے، دوسروں سے لکھواتے تھے۔ ایسے میں یہ بات، گو حالی ہی کی کہی ہوئی ہے، جی کو نہیں لگتی کہ غالب نے کوئی قصہ " مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔"

اس موقف کو حالی سے مقدم ایک نادر اور معاصر ماخذ سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ میری مراد میر مہدی مجروح کے ایک مضمون سے ہے جو غالب کے انتقال کے فوراً بعد ۱۷۔ فروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار دہلی میں شائع ہوا اور جسے غالب کے بعد غالب کے حالات میں پہلا مضمون خیال کرنا چاہیے۔ مجروح لکھتے ہیں کہ :

" ..... جناب مرحوم دو تین مہینے صاحب فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سہے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا۔" [۱۰]

ایسے میں کہ دو تین مہینے صاحب فراش رہے ضعف و نقاہت کے صدمے سہے، آٹھ دن، انتقال سے پہلے کھانا پینا تک ترک ہوا، اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا باور نہیں آتا کہ انھوں نے کیوں کر " مرنے سے چند روز پہلے " کسی قصے کی تصنیف کا ڈول ڈالا ہوگا .... اور خصوصیت سے اس صورت میں تو اور بھی کہ اس مُبیّنہ " ناتمام اردو قصے کے اجزاء " کہیں دستیاب بھی نہیں ہوتے ___

یہاں ایک شبہے کا اظہار کر دینا بے محل نہ ہوگا ..... ہو سکتا ہے کہ حالی نے " چند برس " لکھا ہو، اور سہوِ کتابت سے یہ " چند روز " ہو گیا ہو یا " چند برس " کی جگہ روانی میں

---

[۱۰] اکمل الاخبار، دہلی جلد ۴ نمبر ۷، مطبوعہ ۱۷۔ فروری ۱۸۶۹ء روز چہار شنبہ مطابق ۴۔ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ۔ ص ۵۵

حالی ہی کے قلم ہی سے "چند روز" نکل گیا ہو، گو اس سے مقصود یہ نہ ہو۔

اگر حالی کی اس عبارت : "مرنے سے چند روز پہلے" کو .... چند برس پہلے مان لیا جائے تو اس صورت میں حالی کا اشارہ اس قصّے کی طرف ہو سکتا ہے ، ہنری اسٹورٹ ریڈ کے حوالے سے جس کا ذکر غالب نے دسمبر ۱۸۵۸ء کے اپنے بعض مکاتیب موسومہ شیو نرائن میں کیا ہے ، لیکن یہ محض تاویل ہو گی۔ اس لیے کہ ریڈ صاحب کی فرمائش پر غالب اپنے انتقال سے کوئی دس گیارہ برس پہلے "قصہ کہانی" لکھنے کے چکّر میں پڑے تھے۔ دس گیارہ برس کی اچھی خاصی مدّت کے لیے حالی کا "چند برس" لکھنا بھی بجائے خود محلِ نظر ہوتا۔

اب تک غالب کی جن پانچ ناپید تحریروں کا ذکر ہوا ، وہ ضخامت کے اعتبار سے کتاب کے حجم کی رہی ہوں گی۔ ان پانچ تصانیف کے علاوہ غالب کے خطوں میں اُن کی بعض دیگر مختصر نگارشات کا ذکر بھی ملتا ہے ، جو اب معدوم ہیں[۴۸] اور ورق دو ورق کے پھیلاؤ سے زیادہ کی نہ رہی ہوں گی۔ یہاں اس طرح کی ایک دو معدوم تحریروں کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا۔

---

[۴۸] اس موقع پر اُن بہت سی معدوم نگارشات کا ماتم مقصود نہیں جنہیں عرفِ عام میں "خط" کہا جاتا ہے۔ مثلاً یوسف مرزا کے نام غالب کے موجود خطوں میں سے پہلے خط کا جملہ یہ ہے :

"..... میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے ' اب سن لو ..... "

[خطوطِ غالب ، مالک رام ، صفحہ ۲۱۰]

لیکن "کل" والا خط اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اس طرح کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ، لیکن یہاں خطوط سے قطعِ نظر ، صرف دیگر نگارشات سے بحث ہے۔

[۶]

سنینِ فارسیہ کا حال

تالیف : ۱۸۶۰ء

"سنینِ فارسیہ" کے بارے میں خلیفہ احمد علی صاحب[1] احمد رامپوری کے نام ایک خط میں جو جنوری سے مارچ ۱۸۶۰ء تک کے دوران میں کسی وقت لکھا گیا، غالب کہتے ہیں کہ :

"..... فقیر شب کو آپ کا منتظر رہا۔ آپ تشریف نہ لائے۔ ناچار تقریر کو تحریر کا پیرایہ دے کر آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں[2]۔ سنینِ فارسیہ کا حال بسبیلِ اجمال ایک دو ورقے پر مندرج ہے، بہ نظرِ اصلاح مشاہدہ ہو۔"

[مکاتیبِ غالب ؛ طبع دوم ۱۹۴۳ء، مرتبہ عرشی، صفحہ ۱۱۴]

---

[1] خلیفہ شیخ احمد علی صاحب احمد تخلص، والد شیخ نادر علی تقریباً ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ رام پور کے اکثر فارسی ادب کے علما کا سلسلہ اُن تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں (یوسف علی خاں ناظم) اور نواب عرش آشیاں (کلب علی خاں) طاب ثراہما کی اُستادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹۔ رمضان ۱۳۰۹ھ (۲۸۔ اپریل ۱۸۹۲ء) کو نوّے سال کی عمر میں اپنے مکان واقعہ محلہ بنگلہ آزاد خاں (رام پور) میں انتقال کیا۔ اُن کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے۔

[عرشی، مکاتیبِ غالب، صفحہ ۱۱۳]

[2] میرزا غالب رام پور تشریف لائے اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو مؤخر الذکر نے اثنائے گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی۔۔۔۔ مرزا نے عرفی کی حمایت کی، لیکن اس وقت بحث ناتمام رہی اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آ کر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس رات کو تشریف نہ لے جا سکے اس لیے میرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیے۔ [عرشی، مکاتیبِ غالب، صفحہ ۱۱۳]

غالب کے اس خط کی بازیافت اور سنینِ فارسیہ سے متعلق اُن کی نگارش کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں کہ :

"میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبدالحکیم خاں صاحب مُدرّس فارسی، مدرسۂ عالیہ، رامپور سے مبلغ پچیس روپے میں خریدا گیا تھا۔ خیال تھا کہ سنینِ فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقہ بھی موصوف الذکر بزرگ کے پاس ہوگا لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہو سکا۔"

[حواشی، مکاتیب غالب، ص ۱۸۰]

[۷]

سولہ شعراء کے تراجم

تالیف : ۱۸۶۴ء

غالب نے قائم مقام ڈپٹی کمشنر شہر دہلی مسٹر ریٹیگن کی فرمائش پر اپنے سولہ واقفِ حال ہم عصر شعراء کا مختصر حال قلم بند کیا تھا اور جس طور پر قلم بند کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساری تفصیل ایک دو ورق میں آگئی ہوگی۔ لیکن یہ نگارش، اب معدوم ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے ایک خط، روز جمعہ ۹- دسمبر ۱۸۶۴ء سے اس کا سراغ ملتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں کہ بیماری و ناتوانی کے باعث :

"کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترکِ ملاقات ہے مگر ڈپٹی کلکٹر کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختارکا

کو تنخواہ نہ ملے ۔ ڈکرودر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے ۔ اُن کی جگہ ریٹیگن صاحب[۱] مقرر ہوئے ۔ ان سے ناچار ملنا پڑا ۔ وہ تذکرہ شعرائے[۲] ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں ۔ مجھ سے بھی اُنھوں نے مدد چاہی ۔ میں نے سات کتابیں، بھائی ضیاء الدین صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں ۔ پھر انھوں نے بعد میں مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو اچھی طرح جانتا ہے، اُن کا حال لکھ بھیج ۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے ، بہ قید اس کے، کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے :

---

[۱] اپنے اسی خط مرقومہ ۹۔ دسمبر ۱۸۶۴ء کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ :

رینیگن صاحب اب عدالتِ خفیفہ کے جج ہو گئے۔ ڈکرودر صاحب پہاڑ سے آگئے ۔ اپنا کام کرنے لگے ۔ رینیگن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے ۔"

تفتہ ہی کے نام ۱۲۔ فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں کہ :

" رینیگن صاحب پنجشنبے کے دن ، ۱۶ جنوری سنہ حال کو . . . . پنجاب کو گئے ۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں حاکم ہوئے ہیں ۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقاتِ تودیع کو نہیں گیا ۔"

رینیگن صاحب لاہور میں بھی "حاکم" رہے ۔ چنانچہ لاہور میں رینیگن روڈ، اُن ہی کے نام سے منسوب ہے۔

[۲] تذکرۃ الشعراء کے تعارف میں رجوع کیجیے، مضمون "میرزا غالب کی خودنوشت سوانح عمری کا ایک ورق" متعارفہ :

۱ ۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اُردو، اورنگ آباد، جولائی ۱۹۲۸ء، صفحہ ۳۲۷ ۔ ۳۲۹

۲ ۔ اظہار الحق ملک ، احوالِ غالب (آزاد) علی گڑھ ، ۱۹۵۳ء ، صفحہ ۲۳ ۔ ۲۸

۳ ۔ سعیدہ اداہی ، آج کل ، دہلی ، فروری ۱۹۵۵ء ، صفحہ ۷ ۔ ۱۲

○ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، رئیس لوہارو :

فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں ۔ فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں ۔ اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔

○ نواب مصطفیٰ خاں بہادر، علاقہ دار جہانگیر آباد :

اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے ۔

○ منشی ہرگوپال معزز قانون گو سکندر آباد کے :

فارسی میں شعر کہتے ہیں ۔ تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد ۔

. . . . . اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا اور اس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہوگا ۔"

غرض اس انداز پہ غالب نے سولہ شاعروں کا حال لکھا ۔ تین کے کوائف بطور نمونہ غالب نے مذکورہ خط میں درج کیے، یہ محفوظ رہ گئے ۔ بقیہ تیرہ کے اسماء واحوال کی کیفیت کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوتی، لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ بقیہ تیرہ اصحاب غالب ہی کے حلقے کے ہوں گے اور ان کے حال میں بھی محض نام، تخلص، اُستاد کے نام اور مسکن و موطن کی صراحت ہو گی ؎

کتابیات (مآخذ):

تصانیفِ غالب:

اُردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی (نظامی بدایونی): نظامی پریس، بدایوں، طبع ششم ۱۹۲۷ء

اُردوئے معلّیٰ، طبع اول: اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء

اُردوئے معلّیٰ (مع حصہ دوم): مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۸۹۹ء

اُردوئے معلّیٰ (ہر دو حصہ مع ضمیمہ): مطبع کریمی، باہتمام شیخ مبارک علی، لاہور، ستمبر ۱۹۲۲ء

اُردوئے معلّیٰ، حصہ اول جلد اول (سید مرتضیٰ حسین فاضل): مجلس ترقی ادب، لاہور، اپریل ۱۹۶۹ء

اُردوئے معلّیٰ، حصہ اوّل جلد دوم (سید مرتضیٰ حسین فاضل): مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء

اُردوئے معلّیٰ، حصہ دوم (سید مرتضیٰ حسین فاضل) مجلس ترقی ادب، لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء

ارمغانِ غالب (ایس ایم اکرام): تاج آفس بمبئی ۱۹۴۴ء

انتخابِ غالب (امتیاز علی عرشی): مطبع قیمہ بمبئی ۱۹۴۲ء

باغِ دو در (وزیر الحسن عابدی): اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۶۸ء

بیاضِ غالب (نثار احمد فاروقی)، مشمولہ نقوش شمارہ: ۱۱۳، ۱۹۶۹ء

پنج آہنگ، طبع اوّل، مطبع سلطانی، دہلی، ۱۸۴۹ء

پنج آہنگ، طبع دوم، مطبع دار السلام، دہلی، ۱۸۵۳ء

تیغِ تیز، طبع اوّل، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۷ء

خطوطِ غالب (مالک رام): انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ، ۶۳-۱۹۶۲ء

خطوطِ غالب (غلام رسول مہر): حصہ اول، کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۱ء

خطوطِ غالب، حصہ دوم، کتاب منزل، لاہور، نابعد فروری ۱۹۵۲ء

خطوطِ غالب (غلام رسول مہر): شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۸ء

خطوطِ غالب (غلام رسول مہر)، جلد اوّل، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

خطوطِ غالب (غلام رسول مہر)، جلد دوم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

خطوطِ غالب (مہیش پرشاد): الہ آباد، ۱۹۴۱ء

درفشِ کاویانی: اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

دستنبو: طبع اول، مطبع مفید خلائق، آگرہ، ۱۸۵۸ء

دستنبو: طبع دوم: مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیلکھنڈ، بریلی، ۱۸۶۵ء

دستنبو: (مالک رام): صدی ایڈیشن، دہلی، ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب (اُردو): طبع اول، سید المطابع، دہلی، اکتوبر ۱۸۴۱ء

دیوانِ غالب، طبع دوم: مطبع دارالسلام، دہلی، مئی ۱۸۴۷ء

دیوانِ غالب، طبع سوم، مطبع احمدی، دہلی، جولائی ۱۸۶۱ء

دیوانِ غالب، طبع چہارم، مطبع نظامی، کانپور، جون ۱۸۶۲ء

دیوانِ غالب، طبع پنجم، مطبع مفید خلائق، آگرہ، ۱۸۶۳ء

دیوانِ غالب (نگارستانِ سخن) دہلی، اگست ۱۸۶۴ء

دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ، دہلی، ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) بزمِ اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶ء

دیوانِ غالب (مالک رام) صدی ایڈیشن، دہلی، ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب مع شرح (حسرت موہانی): طبع ثانی، اگست ۱۹۰۶ء

دیوانِ غالب جدید، نسخۂ حمیدیہ (مفتی محمد انوار الحق)، آگرہ، ۱۹۲۱ء

دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ (حمید احمد خاں): لاہور، ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب، نسخۂ شیرانی: مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی (امتیاز علی عرشی): علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

دیوانِ فارسی: مطبع دارالسلام، دہلی، ۱۸۴۵ء

سبدِ چین، طبع اول، مطبع محمدی، دہلی، اگست ۱۸۶۷ء

سبدِ چین (مالک رام): مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۸ء

سبدِ چین (وزیر الحسن عابدی): پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

سوالاتِ عبدالکریم، طبع اول: اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۴ء

عودِ ہندی، طبع اول، مطبع مجتبائی، میرٹھ، اکتوبر ۱۸۶۸ء

عودِ ہندی، مطبع رائنی، دہلی، ۱۸۶۸ء

عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۸۷۸ء

عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۸۸۶ء

عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۹۰۰ء

Scanned with CamScanner

عود ہندی (مرتضیٰ حسین فاضل): مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۶۰ء
غالب کی نادر تحریریں (خلیق انجم): مکتبۂ شاہراہ دہلی، ۱۹۶۱ء
غزلیات فارسی (وزیرالحسن عابدی): پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء
قطعۂ غالب، طبع اول: اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۱ء
قادر نامۂ غالب، مطبع سلطانی، دہلی، ۱۸۵۶ء
قادر نامۂ غالب، مطبع العلوم، دہلی، ۱۸۶۱ء
قادر نامۂ غالب، مجلس پریس، دہلی، ۱۸۶۳ء
قاطع برہان، طبع اول: مطبع نولکشور، لکھنؤ، مارچ ۱۸۶۲ء
قطعات، رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس (غلام رسول مہر): پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء
کلیاتِ غالب، طبع اول، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۳ء
کلیاتِ غالب (مرتضیٰ حسین فاضل) جلد اول: لاہور، ۱۹۶۷ء
کلیاتِ غالب (مرتضیٰ حسین فاضل) جلد دوم: مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء
کلیاتِ غالب (مرتضیٰ حسین فاضل)، جلد سوم: لاہور، ۱۹۶۷ء
کلیاتِ نثرِ غالب، طبع اول: مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء
کلیاتِ نثرِ غالب، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۰۰ء
کلیاتِ نثرِ غالب، مطبع نولکشور، کانپور ۱۹۰۰ء
گلِ رعنا، خطی نسخہ مخزونہ حکیم محمد نبی جمال سویدا، لاہور
گلِ رعنا، نسخۂ غالب بخطِ غالب، مخزونہ خواجہ ...، لاہور
گلِ رعنا (قدرت نقوی): انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۵ء
گلِ رعنا (مالک رام): علمی مجلس، دلی، ۱۹۷۰ء
گلِ رعنا (وزیرالحسن عابدی): ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۰ء
لطائفِ غیبی، طبع اول، اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۴ء
متفرقاتِ غالب (مسعود حسن رضوی ادیب) رام پور ۱۹۴۷ء
متفرقاتِ غالب (مسعود حسن رضوی ادیب): کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء
مثنوی ابرِ گہر بار، اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۳ء
مثنوی دعاءِ صباح، مطبع نولکشور لکھنؤ، ماقبل ۱۸۶۹ء
مرقعِ غالب (پرتھوی چندر): دہلی، ۱۹۶۰ء
مکاتیبِ غالب (امتیاز علی عرشی)، طبع اول: مطبع قیمہ، بمبئی، ۱۹۳۷ء
مکاتیبِ غالب (عرشی)، طبع سوم: ۱۹۴۳ء

طبع سوم: ۱۹۴۵ء، طبع چہارم، ۱۹۴۶ء
طبع پنجم: ۱۹۴۷ء
مہر نیمروز، طبع اول: فخر المطابع، دہلی ۱۸۵۴ء
میخانۂ آرزو سرانجام (قلمی نسخہ، ۱۸۳۴ء) مخزونہ
انجمن ترقی اردو، کراچی
نادرات غالب (آفاق دہلوی): ادارۂ نادرات، کراچی ۱۹۴۹ء
نامۂ غالب، طبع اول: مطبع محمدی، دہلی ۱۸۶۵ء
نامہ ہائے فارسی غالب (اکبر علی ترمذی):
غالب اکیڈمی، دہلی ۱۹۶۹ء
نکات و رقعات غالب طبع اول: مطبع سراجی،
دہلی ۱۸۶۷ء

دیگر مصادر:

آزاد، محمد حسین: آب حیات، وکٹوریہ پریس،
لاہور، ۱۸۸۰ء
آب حیات، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء
آغا، افتخار حسین: یورپ میں تحقیقی مطالعے، مجلس
ترقی ادب، لاہور، نومبر ۱۹۶۷ء
احسن علی خاں، صاحبزادہ: مقدمۂ غالب،
مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۹ء
احمد علی احمد جہانگیر نگری: موید برہان، مطبع
مظہر العجائب، کلکتہ، ۱۸۶۶ء
اکرام، ایس۔ ایم (ڈاکٹر): غالب نامہ، طبع اول
سورت، بمبئی ۱۹۳۶ء
غالب نامہ، آثار غالب، طبع چہارم، تاج آفس بمبئی
امجد، الشیخ محمد ریاض الدین: سیر دہلی، مطبع حیدری، آگرہ
۱۸۶۱ء
امداد صابری: تاریخ صحافت اردو، جلد دوم
طبع اول، دہلی
اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی
لاہور، جلد ۲، ۱۹۶۶ء
بلقی و سخن: ہنگامۂ دل آشوب، مطبع منشی
سنت پرشاد، آرہ، ضلع شاہ آباد، بہار،
اپریل ۱۸۶۷ء
ہنگامۂ دل آشوب (حصہ دوم): مطبع منشی
سنت پرشاد، آرہ، ضلع شاہ آباد، بہار
ستمبر ۱۸۶۷ء
بے خبر، خواجہ غلام غوث: انشائے بے خبر
فغان بے خبر
جاوید اقبال (ڈاکٹر جسٹس): مے لالہ فام،
شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۶ء
چغتائی، محمد اکرام: نگار دہلوی — حالات،
انتخاب کلام، کتابیات، لاہور ۱۹۶۸ء
حالی، الطاف حسین: یادگار غالب، نامی پریس
کانپور، ۱۸۹۷ء
یادگار غالب، مطبع ریاض ہند، علی گڑھ
یادگار غالب، انوار المطابع، لکھنؤ ۱۹۲۲ء

حبیب خاں، ایم: غالب اور سرود، کوہ نور
پرنٹنگ پریس، دلی، ۱۹۷۵ء

دتاسی، گارساں: تاریخ ادب ہندوی و
ہندوستانی، جلد ا، مطبوعہ پیرس ۱۸۷۰ء

خطبات گارساں دتاسی: انجمن ترقی اردو،

داؤد آفریدی: ادبی اقدار، اردو ریسرچ اکاڈمی
رامپور، ۱۹۷۳ء

رشید احمد صدیقی: آپ بیتی (ڈاکٹر معین الرحمٰن)
مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۰ء

رشید حسن خاں: ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ،
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

ذکا، خوب چند: عیار الشعرا (قلمی)، نونوشت
مخزونہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

سرور، محمد خان: عمدۂ منتخبہ (خواجہ احمد فاروقی):
شجاعت علی سندیلوی (چیف ایڈیٹر)، ادبی تحقیق؛
اردو سوسائٹی، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی،
لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر: فلسفۂ کلام غالب،
قومی کتب خانہ، بریلی، ۱۹۴۶ء
طبع دوم: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۹ء

صفیر بلگرامی: جلوۂ خضر، مطبع نور الانوار،
آرہ، ۱۸۸۴ء

ظ۔ انصاری/ ابو الفیض سحر، خسرو شناسی،
دہلی، ۱۹۷۵ء

ظ۔ انصاری: غالب شناسی، طبع اول بمبئی ۱۹۶۵ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر: جشن نامہ، یونیورسٹی
اورینٹل کالج، لاہور، دسمبر ۱۹۷۲ء

عبد الحق، ڈاکٹر مولوی: تنقیدات عبد الحق،
طبع چہارم، لاہور ۱۹۴۵ء
چند ہم عصر، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۰ء
رپورٹ انجمن ترقی اردو (ہند) جنوری۔ مارچ ۱۹۱۴ء
مقدمات عبد الحق (عبادت بریلوی) کراچی ۱۹۶۴ء

عبد اللطیف، ڈاکٹر سید: غالب۔ اے کریٹیکل
ایپری سی ایشن آف ہز لائف اینڈ اردو پوئٹری،
طبع ثانی، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۹ء

عبد الودود، قاضی: آثار غالب، علی گڑھ میگزین
غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء

عتیق صدیقی: غالب اور ابو الکلام، مکتبہ شاہراہ،
دہلی، فروری، ۱۹۶۹ء

عروج عبد الرؤف: بزم غالب، ادارۂ یادگار غالب،
کراچی، ۱۹۶۹ء

فاروقی، نثار احمد: بیاض غالب، مشمولہ،
نقوش لاہور شمارہ ۱۱۱، اپریل ۱۹۶۹ء

فائق، نور الدین حسین خاں: مخزن شعرا
(مولوی عبد الحق)، انجمن ترقی اردو،
اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

فرمان فتحپوری، ڈاکٹر: اردو شعرا کے تذکرے اور
تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، نومبر ۱۹۷۲ء

غالب — شاعر امروز و فردا: انڈس پبلشرز، لاہور ۱۹۷۰ء

صابر، مرزا قادر بخش: مطبع مرتضوی دہلی ۱۸۵۵ء

قاسمی، احمد ندیم (مرتب): نذرِ حمید احمد خاں، لاہور ۱۹۸۰ء

قدرت نقوی: ہنگامۂ دل آشوب، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۹ء

قمر النساء شیخ: ایس ایم اکرام بطور غالب شناس (قلمی) ۱۹۷۶ء۔ مخزونہ: کتب خانہ ڈاکٹر سید معین الرحمن (لاہور)

گیان چند، ڈاکٹر: رموزِ غالب، مکتبہ جامعہ دہلی فروری ۱۹۷۶ء

لیلیان نذرد: تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی (قلمی) مخزونہ: کتاب خانہ کراچی یونیورسٹی، کراچی

مالک رام: تلامذۂ غالب، مرکز تصنیف و تالیف نکودر، ۱۹۵۷ء

ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۳ء

ذکرِ غالب، طبع پنجم، دہلی، ۱۹۷۶ء

مجروح، میر مہدی: دیوانِ مجروح، مظہر معانی سرفراز پریس، دہلی ۱۸۹۹ء

محمد انصار اللہ: غالب ببلیوگرافی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۷۲ء

مختار الدین احمد، ڈاکٹر: احوالِ غالب، علی گڑھ ۱۹۵۳ء

معین الرحمن، ڈاکٹر سید: اشاریۂ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ (قلمی) ۱۹۷۲ء

غالب اور انقلاب ستاون، طبع اول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء

غالب اور انقلاب ستاون، طبع دوم، لاہور، ۱۹۸۲ء

دیوانِ غالب، شیر اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۲ء

مہر، غلام رسول: غالب، طبع اول، شیخ مبارک علی، مسلم پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۳۶ء

غالب: طبع دوم، شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۴۱ء

غالب: طبع سوم، شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۴۴ء

غالب: طبع چہارم، شیخ مبارک علی، تاجر کتب لاہور، ۱۹۴۶ء

نجمہ نیاز: مطالعۂ غالب — انیسویں صدی میں (قلمی) ۱۹۷۶ء، مخزونہ: کتاب خانہ، ڈاکٹر سید معین الرحمن (لاہور)

نذرِ ذاکر، دہلی ۱۹۶۸ء

نیر سلطانہ: مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس (قلمی) ۱۹۷۹ء، مخزونہ: کتاب خانہ، ڈاکٹر سید معین الرحمن (لاہور)

وحید قریشی، ڈاکٹر: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، لاہور، ۱۹۶۵ء

یوسف حسین خاں، ڈاکٹر: بین الاقوامی غالب سمینار، دہلی ۱۹۶۹ء

انٹرنیشنل غالب سمینار (انگریزی) دہلی ۱۹۶۹-۷۰ء

اخبارات ورسائل :

آج کل، دہلی: فروری ۱۹۵۵ء، فروری ۱۹۶۲ء
اخبار سید شیف موسسۂ علی گڑھ: ۱۰۔ مارچ ۱۸۶۹ء
اخبار عالم، میرٹھ: ۲۲۔ اپریل ۱۸۶۹ء
ادبی دنیا، لاہور: دسمبر ۱۹۴۹ء
ادبی دنیا، لاہور: شمارہ دوازدہم ۱۹۶۳ء
اردو، اورنگ آباد: جنوری ۱۹۲۱ء، اکتوبر ۱۹۲۱ء
جنوری ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۳ء، جولائی ۱۹۲۳ء
اپریل ۱۹۲۸ء، جولائی ۱۹۲۸ء، جنوری ۱۹۲۹ء
اپریل ۱۹۲۹ء، جولائی ۱۹۲۹ء، اکتوبر ۱۹۲۹ء
جنوری ۱۹۳۲ء، جنوری ۱۹۳۳ء، جنوری ۱۹۳۴ء
اپریل ۱۹۳۵ء
اردو، دہلی: جولائی ۱۹۳۹ء، اکتوبر ۱۹۳۹ء
جنوری ۱۹۴۲ء، اپریل ۱۹۴۲ء، اپریل ۱۹۴۳ء
اکتوبر ۱۹۴۴ء
اردو، کراچی: اپریل ۱۹۵۰ء، جولائی ۱۹۵۵ء، جولائی ۱۹۵۸ء
جنوری ۱۹۵۹ء، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء
اپریل تا جون ۱۹۶۹ء، جنوری تا مارچ ۱۹۶۱ء
اردو ادب، علی گڑھ: جنوری تا اپریل ۱۹۵۱ء
شمارہ ۲، ۱۹۶۰ء
اردو نامہ، کراچی: اکتوبر ۱۹۶۲ء

اردوئے معلیٰ، دہلی: فروری ۱۹۶۰ء، فروری ۱۹۶۱ء
اردوئے معلیٰ، علی گڑھ: جولائی ۱۹۰۳ء
اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، مسلینی
جلد ۱، آئی۔آر۔اے سیریز ۱۲، ۱۹۴۸ء
افکار، کراچی: فروری، مارچ ۱۹۶۶ء
اکمل الاخبار، دہلی: اکتوبر ۱۸۶۸ء
۱۰۔ فروری ۱۸۶۹ء، ۲۴۔ فروری ۱۸۶۹ء
۳۔ مارچ ۱۸۶۹ء، ۱۰۔ مارچ ۱۸۶۹ء
۱۷۔ مارچ ۱۸۶۹ء
العصر، لکھنؤ: جون ۱۹۱۳ء
العلم، کراچی: جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء
الناظر، لکھنؤ: یکم مئی ۱۹۱۴ء
الواعظ، لکھنؤ: جولائی ۱۹۵۰ء، جولائی ۱۹۵۱ء
الہلال، کلکتہ: ۱۷۔ جون ۱۹۱۴ء
بلیک ووڈز، ایڈنبرگ میگزین:
جنوری ۱۸۲۸ء
پگڈنڈی، امرتسر: مارچ ۱۹۶۰ء
دہلی اردو اخبار: ۲۰۔ اگست ۱۸۵۲ء
ذخیرہ (بالگوبند)، آگرہ: مارچ ۱۸۶۹ء
راوی، لاہور: اپریل ۱۹۶۹ء
رتن پرکاش، رتلام (سندیل کھنڈ):
۵۔ مارچ ۱۸۶۹ء
زبان وادب، پٹنہ: اکتوبر ۱۹۶۹ء
زمانہ، کانپور: ستمبر ۱۹۳۵ء

سرکاری اخبار، لاہور : ۲۴۔فروری ۱۸۶۹ء

شاعر، بمبئی : فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

صحیفہ، لاہور : اگست ۱۹۵۹ء ،

جنوری ۱۹۶۹ء ، اکتوبر ۱۹۶۹ء

اپریل ۱۹۷۰ء

طوفان، نواب شاہ (سندھ) : فروری ۱۹۵۲ء

عالمگیر، لاہور : اکتوبر ۱۹۳۷ء

علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء

غالب نمبر ۱۹۶۹ء

غالب نامہ، دھلی : جنوری-اپریل ۱۹۸۹ء

فروغ اردو، لکھنؤ : دسمبر ۱۹۶۸ء

قومی زبان، کراچی : فروری ۱۹۶۷ء ،

دسمبر ۱۹۶۸ء ، جنوری ۱۹۶۹ء

کتاب نما، دھلی : اپریل ۱۹۷۸ء

ماہ نو، کراچی : فروری ۱۹۵۰ء ، جولائی ۱۹۵۲ء

فروری ۱۹۵۳ء ، فروری ۱۹۵۵ء ، فروری ۱۹۶۲ء

فروری ۱۹۶۵ء

مجلۂ تحقیق، لاہور : جلد ۲، شمارہ ۱، ۱۹۸۹ء

مخزن، لاہور : مئی ۱۹۰۳ء ، مئی ۱۹۰۷ء

معاصر، پٹنہ : قاضی عبدالودود نمبر ،

دائرۂ ادب پٹنہ ، اگست ۱۹۷۹ء

نقوش، لاہور : شمارہ ۱۱۱، اپریل ۱۹۶۹ء

شمارہ ۱۱۳ ، اکتوبر ۱۹۶۹ء ، شمارہ ۱۱۶

۱۹۷۱ء ، شمارہ ۱۲۲ جنوری ۱۹۷۷ء

نگار، لکھنؤ : جولائی ۱۹۶۰ء ، سالنامہ مذکروں

کا تذکرہ نمبر ۱۹۶۴ء

نوائے ادب، بمبئی ، جولائی ۱۹۵۵ء

نوائے وقت، لاہور : ۱۴۔ نومبر ۱۹۷۵ء

ہماری زبان، علی گڑھ : ۱۵۔ اگست ۱۹۶۹ء ،

یکم ستمبر ۱۹۷۰ء

ہم قلم، کراچی : اگست ۱۹۶۲ء

ہندوستانی، الہ آباد : اکتوبر ۱۹۳۵ء

○

اقبال سب کے لیے

از

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

"اقبال بیسویں صدی کا ایک ایسا عظیم مفکر شاعر ہے جس نے جدید فلسفے کے گہرے مطالعے انسانی غمخواری کے شدید جذبے اور غیر معمولی فنی بصیرت کی مدد سے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے اقبال اور اقبالیات کے مطالعے کی مقبولیت و اہمیت بھی بڑھتی جا رہی ہے اس مرتبے کا شاعر اگر کسی اور ملک یا زبان میں پیدا ہوتا تو اس کے لیے کیا کچھ نہ کیا جاتا اور کیا کچھ نہ لکھا جاتا پھر بھی ہمارے مخصوص حالات میں اقبال کے فکر و فن کے بعض پہلوؤں پر خاصا کام ہوا ہے۔ بہت اچھی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں لیکن ہنوز کسی ایسی مستند تصنیف کا وجود نہیں جس میں اقبال کی سیرت و سوانح، فکر و فن، نظریات و عقائد، کتب و مقالات، تعلیمی افکار و سیاسی خدمات، فکری و تخیلی ارتقا، ان کے عوامل، محرکات اور منظر و پس منظر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو، یا تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہو اور جس کے بارے میں اعتماد کے ساتھ کہا جا سکے کہ اس میں وہ سب کچھ پوری صحت کے ساتھ موجود ہے جو اقبال کو ہر سطح پر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ زیرِ نظر کتاب، اقبال اور اقبالیات کے سلسلہ میں اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔"

قیمت مجلد ایک سو روپے پیپر بیک پینتیس روپے

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی